شذرات		
فوج کی حکمرانی	منظور الحسن	۲
قرآنیات		
النساء (۴: ۲۹-۳۳)	جاوید احمد غامدی	۷
دین و دانش		
ایمانیات (۱۴)	جاوید احمد غامدی	۱۳
نقطۂ نظر		
مسجد اقصیٰ کی تولیت	حافظ محمد زبیر	۱۹
مسجد اقصیٰ کی بحث اور حافظ محمد زبیر کے اعتراضات	محمد عمار خان ناصر	۴۸
مدیر 'محدث' کے نام جناب عمار خان ناصر کا مکتوب	محمد عمار خان ناصر	۵۸
یسئلون		
متفرق سوالات	محمد رفیع مفتی	۶۱
متفرق سوالات	طالب محسن	۶۸

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

منظور الحسن

فوج کی حکمرانی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہمارے سیاسی کلچر میں فوج کی حکمرانی کو اب ایک روایت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ سیاسی جماعتیں باہم برسر پیکار ہوتی ہیں؛ سیاست دان ایک دوسرے کے وجود کو برداشت کرنے سے انکار کرتے ہیں؛ سول حکومتیں بدانتظامی، عدم استحکام اور اخلاقی انحطاط کا بدترین نمونہ پیش کرتی ہیں؛ عوام الناس حکمرانوں کے آگے اپنے مسائل حل نہ ہونے کا رونا روتے ہیں؛ غیر مقبول مذہبی اور سیاسی گروہ فوج کو حکومت سنبھالنے کی پیشکش کرتے ہیں اور فوجی جنرل پوری آمادگی دل کے ساتھ اس صداے خوش نوا پر لبیک کہتے اور قوم کے مسیحا کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ آئین کو بالاے طاق رکھ کر مسند اقتدار پر فائز ہوتے ہیں، اقتدار کے زیادہ سے زیادہ مظاہر کو اپنی ذات میں مرتکز کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کچھ استحکام حاصل کر لینے کے بعد اپنے اقتدار کے آئینی جواز کے لیے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں، اقتدار کو طول دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور بالآخر عوام کی ناپسندیدگی کا داغ اپنے دامن پر سجا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ جنرل ایوب خان، جنرل یحییٰ خان، جنرل ضیاء الحق نے یہی روایت قائم کی ہے اور جنرل پرویز مشرف بھی اسی کو پروان چڑھا رہے ہیں۔

فوج کے اقتدار پر قابض ہونے سے چند ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جو ہمارے نزدیک ملک و قوم کے لیے ضرر رساں ہیں۔

ایک مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے اقدامات کے نتیجے میں اس اصول پر زد پڑتی ہے جو شریعت کی رو سے مسلمانوں کے اجتماعی نظام کی اساس ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے: 'وامرھم شوریٰ بینھم'، یعنی مسلمانوں کا نظام

ان کے باہمی مشورے پر مبنی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ریاست کی سطح پر اجتماعی نوعیت کا کوئی فیصلہ مسلمانوں کی مشاورت کے بغیر نہیں ہوگا اور اس ضمن میں ان کی رائے کو حتمی حیثیت حاصل ہوگی۔ استاذ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے اجتماعی نظام کی اساس 'امرھم شوریٰ بینھم' ہے، اس لیے ان کے امرا و حکام کا انتخاب اور حکومت و امارت کا انعقاد مشورے ہی سے ہوگا اور امارت کا منصب سنبھال لینے کے بعد بھی وہ یہ اختیار نہیں رکھتے کہ اجتماعی معاملات میں مسلمانوں کے اجماع یا اکثریت کی رائے کو رد کر دیں۔'' (قانون سیاست ۲۶)

دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے اقدامات آئین کی خلاف ورزی پر منتج ہوتے ہیں۔ ہمارا آئین درحقیقت وہ دستور العمل ہے جس کے بارے میں قوم نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنے اجتماعی امور کو اس کی روشنی میں انجام دے گی۔ اس میں ہم نے قومی سطح پر یہ طے کیا ہے کہ ہمارا نظام حکومت کیا ہوگا؟ حکومت کس طریقے سے وجود میں آئے گی اور کس طریقے سے اسے تبدیل کیا جا سکے گا؟ سربراہان ریاست و حکومت کس طریقے سے منتخب ہوں گے، ان کے کیا اختیارات ہوں گے اور کس طرح ان کا مواخذہ کیا جا سکے گا؟ یہ اور اس نوعیت کے بے شمار امور جزئیات کی حد تک اس دستور میں طے کیے جا چکے ہیں۔ کسی بھی قوم کا سیاسی استحکام اس بات میں مضمر ہوتا ہے کہ آئین کے لفظ لفظ پر پوری دیانت داری سے عمل کیا جائے۔

تیسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے اقدامات کے نتیجے میں جمہوری اقدار کی ترویج رک جاتی ہے۔ سیاسی عمل میں رخنہ آ جاتا ہے اور قومی تعمیر و ترقی کا عمل متاثر ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ بات ہر لحاظ سے ثابت شدہ ہے کہ جس معاشرے میں جمہوری اقدار مستحکم ہوں گی، وہ تعمیر و ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوری اقدار معاشرے کے افراد کو باشعور بناتی، ان کے اندر اعتماد پیدا کرتی اور انھیں مستقبل کی بہتری کے لیے سرگرم عمل کر دیتی ہیں۔ فوجی حکمرانوں کی آمد سے چونکہ قومی معاملات میں ان کی شرکت کا راستہ بند ہو جاتا ہے، اس لیے وہ کوئی فعال کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جملۂ معترضہ کے طور پر مختصراً ان اعتراضات کا جائزہ بھی لے لیا جائے جو ہمارے ہاں جمہوریت کے حوالے سے پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جمہوری نظام حکومت ان ممالک کے لیے ناموزوں ہے جہاں خواندگی کی شرح کم ہو۔ جناب پرویز مشرف صاحب نے بھی منصب صدارت پر فائز ہونے سے کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک بیان کے

ذریعے سے اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ:

''پاکستان کا ماحول پارلیمانی جمہوریت کے لیے سازگار نہیں ہے۔ ایک ایسا ملک جس کی چودہ کروڑ آبادی میں سے ستر فی صد لوگ ناخواندہ ہیں، اس سے دنیا کیوں توقع رکھتی ہے کہ وہ مغربی طرز کی جمہوریت کا حامل ہو۔'' (روزنامہ جنگ، ۳۰ جون ۲۰۰۱)

پارلیمانی جمہوریت سے مراد وہ طرز حکومت ہے جس میں پارلیمان کو ریاست کے سب سے برتر ادارے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ادارہ عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ عوام کے یہ نمائندے اپنے اندر سے ایک وزیر اعظم کا انتخاب کرتے ہیں۔ وزیر اعظم اپنی کابینہ کے ذریعے سے حکومت کا نظم چلاتا ہے۔ وہ اپنے تمام اقدامات کے حوالے سے پارلیمان کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ ارکان پارلیمان اگر اس کی کارکردگی سے غیر مطمئن ہوں تو وہ اسے تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔ اس نظام میں صدر کی حیثیت آئینی سربراہ کی ہوتی ہے، نظم حکومت اور قانون سازی کے معاملات میں اس کی مداخلت نہایت محدود ہوتی ہے۔

اس نظام جمہوریت پر مذکورہ اعتراض کے جواب میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ دو باتیں ہی اس کی تردید کے لیے کافی ہیں:

ایک یہ کہ اس بات کا فیصلہ کہ اہل پاکستان کے لیے کون سا نظام درست ہے اور کون سا درست نہیں ہے، دین، اخلاق اور اجتماعی مصالح کے لحاظ سے اہل پاکستان ہی کو کرنا چاہیے۔ ۱۹۷۳ء تک اہل پاکستان دانستہ یا نادانستہ طور پر مختلف نظام ہاے حکومت کا تجربہ کر چکے تھے۔ اس موقع پر ان کے منتخب نمائندوں نے بہت سوچ بچار کے بعد پارلیمانی نظام حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستانی قوم اپنے اس فیصلے پر ابھی تک قائم ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ فیصلہ پاکستان کے قومی مفاد میں نہیں ہے تو انھیں رائے عامہ کو اپنے نقطۂ نظر کے حق میں ہموار کرنا چاہیے، یہاں تک کہ لوگوں کی اکثریت ان کی رائے کو اپنی رائے کے طور پر اختیار کر لے۔ رائے عامہ کی تائید کے بغیر کیا جانے والا اجتماعی اقدام کسی لحاظ سے بھی درست قرار نہیں پا سکتا۔

دوسری یہ کہ سیاسی شعور کے ہونے یا نہ ہونے کا تعلیم و تعلم سے کوئی ایسا گہرا تعلق بھی نہیں ہے کہ محض تعلیم کی کمی کو سیاسی شعور کی کمی پر محمول کر لیا جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تعلیم اجتماعی شعور کی بیداری میں معاون ثابت ہوتی ہے، مگر حقیقی معنوں میں سیاسی شعور سیاسی عمل کے تسلسل اور استحکام سے پیدا ہوتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو واضح ہو گا کہ اس قوم میں سیاسی شعور کی ایسی کمی نہیں ہے کہ اسے حق رائے دہی سے محروم کر دیا جائے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۱۹۴۷ء میں اس قوم نے اپنے ووٹوں ہی کے ذریعے سے علیحدہ مملکت اوراس کے لیے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت کا فیصلہ کیا۔۱۹۶۹ء میں اس قوم نے اپنی پرزور تحریک سے جنرل ایوب خان جیسے باجبروت حکمران کواقتدار سے علیحدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا۔کیا یہ سیاسی شعور کا اظہار نہیں ہے کہ اس قوم نے بتدریج مذہبی سیاست کو بالکلیہ ختم کر دیا اور ملک کو دو جماعتی نظام کی طرف گام زن کر دیا ہے؟ یہ بات صحیح ہے کہ ہماری عوامی سیاست ابھی تک جاگیرداروں اور صنعت کاروں کے حصار سے نہیں نکلی، لیکن اس کی اصل وجہ عوام کی ناخواندگی نہیں، بلکہ سیاسی عمل میں بار بار آنے والا تعطل ہے۔اگر یہ سیاسی عمل کسی انقطاع کے بغیر جاری رہے تو یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آیندہ تین چار انتخابات کے بعد شفاف نظام سیاست کے قیام اور باصلاحیت اور باکردار حکمرانوں کا انتخاب بہت آسان ہو جائے گا۔پاکستان کی سیاسی تاریخ کے معروف محقق جناب ڈاکٹر صفدر محمود اپنی کتاب ''پاکستان ـــــ تاریخ وسیاست'' میں لکھتے ہیں:

''تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ پاکستان کے عوام کی سیاسی پسماندگی کا رونا ان حکمرانوں نے رویا ہے جن کی کوئی نمائندہ حیثیت نہیں تھی۔اس بدعت کا آغاز میجر جنرل سکندر مرزا سے ہوا۔پھر یہ روایت فیلڈ مارشل ایوب خان سے ہوتی ہوئی صدر ضیا الحق تک پہنچی، کیونکہ یہ حکمران غیر سیاسی پس منظر کے مالک اور عوام سے الرجک تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے جو حقیقی معنوں میں قوم کے قائد تھے کبھی بھی عوام کی ناخواندگی یا سیاسی پسماندگی کی شکایت نہیں کی، حالانکہ اس وقت ناخواندگی کی شرح کہیں زیادہ تھی۔

دنیا میں کسی ایسے ملک کی مثال نہیں ملتی جس کے عوام نے اپنے ووٹ کے تقدس کے تحفظ کی خاطر اتنی قیمتی جانوں اور املاک کا نذرانہ پیش کیا ہو جتنا پاکستانی عوام نے ۱۹۷۷ء میں قومی اتحاد کی تحریک کے دوران پیش کیا۔یہ حقیقت میں پاکستان کے اس عام شہری کی فتح تھی جو ہر قیمت پر جمہوریت کی بالادستی کا خواہاں ہے۔کیا ایک ایسی قوم کو جو اپنے ووٹ کے تقدس کا اس قدر شعور رکھتی ہے جمہوریت کے لیے نااہل قرار دینا ناانصافی نہیں ہے؟'' (۲۹۴)

جمہوری نظام پر دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں جمہوری عمل کے نتیجے میں جو سیاسی رہنما منظر عام پر آئے ہیں، انھوں نے ہمیشہ اخلاقی پستی ہی کا مظاہرہ کیا ہے۔حکومت کی زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دینا ملک وقوم کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کرنے کے مترادف ہے۔یہ بات کچھ ایسی غلط نہیں ہے، مگر اس کا علاج قومی اداروں کا انہدام نہیں، بلکہ ان کا استحکام ہے۔ادارے جس قدر مستحکم ہوں گے، احتساب کا نظام بھی اسی قدر بہتر ہو گا۔اگر ہم اداروں کو ان کے بننے کے عمل سے پوری طرح گزرنے ہی نہیں دیں گے تو طالع آزما لوگ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر قربان کرتے رہیں گے۔اداروں کا استحکام بھی سیاسی عمل کے تسلسل کے بغیر ممکن نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

چوتھا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے اقدامات کے لازمی نتیجے کے طور پر عوام اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتے ہیں اور اجتماعی معاملات میں ان کی دل چسپی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ صورت حال معاشرے کی صحت کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں ہے۔ معاشرہ اسی وقت صحیح معنوں میں ترقی کی راہ پر گام زن ہوتا ہے جب اس کا ہر فرد قومی تعمیر کے عمل میں پوری طرح شریک ہو۔ مگر جب وہ اپنے اور اپنی قوم کے مستقبل کے حوالے سے شبہات کا شکار ہوگا تو پوری دل جمعی کے ساتھ اپنا کردار ادا نہیں کر پائے گا۔

پانچواں مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے اقدامات کے نتیجے میں فرد واحد بلا شرکت غیرے اقتدار کا مالک بن جاتا ہے۔ کوئی فرد واحد اپنی ذات میں بہت ایمان دار ہوسکتا ہے، اخلاق و کردار کے حوالے سے بہت بہتر ہوسکتا ہے، قیادت و سیادت کی بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہوسکتا ہے، سیاسی بصیرت سے بہرہ مند ہوسکتا اور قومی تعمیر کے لیے بہت متفکر ہوسکتا ہے۔ یہ تمام خصائص، بلاشبہ کسی فرد کی شخصی عظمت پر دلالت کرتے ہیں، لیکن ان سب کا کسی ایک شخص میں اجماع بھی اسے یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ عوام کی رائے کے بغیر مسند اقتدار پر قابض ہو جائے۔ دین و اخلاق اور عقل و فطرت کے مسلمات کے اعتبار سے اقتدار کے لیے صرف اور صرف ایک شرط ہے اور وہ رائے عامہ کی اکثریت کا اعتماد ہے۔ یہ اعتماد اگر حاصل ہے تو ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر اور نواز شریف جیسے افراد اپنی تمام خامیوں کے باوجود اقتدار کے حق دار ہیں اور اگر یہ اعتماد حاصل نہیں ہے تو ایوب خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف جیسے افراد اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اقتدار کے مستحق نہیں ہیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

البیان
جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۱۰)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ، اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ، وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ، اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا﴿۲۹﴾

ایمان والو، ایک دوسرے کے مال آپس میں باطل طریقوں سے نہ کھاؤ[۷۲]، الاّ یہ کہ باہمی رضامندی سے تجارت کی جائے، اور ایک دوسرے کو قتل نہ کرو[۷۳]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ تم پر بڑا مہربان ہے[۷۴]۔ اور

[۷۲] اس سے مراد وہ طریقے ہیں جو عدل و انصاف، معروف، دیانت اور سچائی کے خلاف ہوں اور جن میں لین دین اور معاملت کی بنیاد فریقین کی حقیقی رضامندی پر نہ ہو، بلکہ ایک کا مفاد ہر حال میں محفوظ رہے اور دوسرے کی بےبسی اور مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے ضرر یا غرر کا ہدف بنایا جائے۔ اسلام میں معاشی معاملات سے متعلق تمام حرمتوں کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ رشوت، چوری، غصب، سود، جوا، غلط بیانی، تعاون علی الاثم، غبن، خیانت اور لقطہ کی مناسب تشہیر سے گریز کے ذریعے سے دوسروں کا مال لے لینا، یہ سب اسی کے تحت داخل ہیں۔ روایتوں میں بیع و شرا اور مزارعت وغیرہ کی جن صورتوں سے منع کیا گیا ہے، وہ بھی اسی کے تحت ہیں۔

[۷۳] اصل الفاظ ہیں: 'ولا تقتلوا انفسکم'۔ ان میں 'انفسکم' کا لفظ بالکل اسی طرح آیا ہے، جس طرح اوپر 'اموالکم' کا لفظ ہے، اس لیے جن لوگوں نے اس سے خودکشی کے معنی لیے ہیں، ان کی رائے عربیت کے خلاف

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا، فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا، وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ، نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ،

(یاد رکھو کہ) جو لوگ ظلم و زیادتی[75] کے ساتھ ایسا کریں گے، اُن کو ہم ضرور ایک سخت بھڑکتی ہوئی آگ میں[76] جھونک دیں گے، اور یہ اللہ کے لیے بہت ہی آسان ہے[77]۔ (اِن گناہوں سے بچو، اِس لیے کہ)

ہے۔ اس کے لیے اسلوب دوسرا ہونا چاہیے۔ اسی طرح یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ایک دوسرے کا مال کھانے اور ناحق کسی کی جان لینے کی حرمت کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک ساتھ جمع کر دیا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...ان کو ایک ساتھ جمع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ مال کی حرص اس کے حصول کے جائز و ناجائز طریقوں کی تمیز اٹھا دیتی ہے اور پھر یہ بیماری لوگوں کو اس طرح اندھا کر دیتی ہے کہ اس کے لیے قتل و خون تک کی نوبت آ جاتی ہے۔ سماجی فسادات اور خوں ریزیوں کے اسباب کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ حرص مال کو ان میں سب سے زیادہ دخل ہے۔ اسلام نے ان دونوں چیزوں کے اس گہرے باہمی رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے کے مال اور ایک دوسرے کی جان، دونوں چیزوں کی حرمت کی یکساں تاکید فرمائی ہے۔''
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۲۸۵)

[۷۴] مطلب یہ ہے کہ جب اللہ مہربان ہے تو وہ کس طرح پسند کر سکتا ہے کہ اس کے بندے ایک دوسرے کا مال ناحق طریقوں سے کھائیں اور ایک دوسرے کو قتل کریں۔ وہ تو یہی چاہے گا کہ لوگ آپس میں 'رحماء بینھم' بن کر زندگی بسر کریں۔

[۷۵] اصل میں 'ظلما و عدوانا' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اگر ایک ساتھ آئیں تو گناہ کی دو الگ الگ صورتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ظلم کا لفظ اس صورت پر دلالت کرتا ہے، جب دھاندلی سے کسی کا حق واجب ادا نہ کیا جائے اور عدوان کا اس صورت پر جب زور و زبردستی سے کسی کے جان و مال پر دست درازی کی جائے۔ اس کے برخلاف الگ الگ آئیں تو کم و بیش ایک ہی مفہوم کے حامل ہو جاتے ہیں۔

[۷۶] اصل میں لفظ 'نارًا' آیا ہے۔ اس کی تنکیر یہاں تفخیم کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۷۷] یہ الفاظ ایک مخفی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ استاذ امام نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَ نُدۡخِلۡکُمۡ مُّدۡخَلًا کَرِیۡمًا﴿۳۱﴾

تمھیں جن چیزوں سے منع کیا جا رہا ہے، اُن کے بڑے بڑے گناہوں سے اگر تم بچتے رہے تو تمھاری چھوٹی برائیوں کو ہم تمھارے حساب سے ختم کر دیں گے اور تمھیں عزت کی جگہ داخل کریں گے۔[۷۸] ۲۹-۳۱

لکھتے ہیں:

''...جو لوگ خدا کو مانتے ہیں، لیکن خدا کی صفات عدل و رحم کا صحیح تصور نہیں رکھتے، وہ اپنے آپ کو الاؤنس دینے میں بڑے فیاض ہوتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے جرائم کرتے چلے جاتے ہیں، لیکن یہود کی طرح توقع یہی رکھتے ہیں کہ خدا ان پر بڑا مہربان ہے، اس لیے سب بخش دے گا۔ قرآن نے یہود کا قول 'سَیُغۡفَرُ لَنَا' جو نقل کیا ہے، وہ اسی ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔ درحقیقت اس قماش کے لوگ شہ تو حاصل کرتے ہیں اس ڈھیل اور مہلت سے جو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق عطا فرماتا ہے، لیکن ان کی حیلہ جو طبیعت آڑ ڈھونڈتی ہے خدا کی رحمت کی۔ حالانکہ خدا رحیم ہے تو آخر وہ ظالموں پر کیوں رحم فرمائے گا۔ اس کی رحمت کے اصلی مستحق تو وہ مظلوم ہیں جو ان کے ہاتھوں زندگی بھر ستائے گئے اور آہ بھی نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی ذہنیت رکھنے والوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ جو لوگ ظلم و عدوان کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کو جہنم میں جھونک دینا خدائے رحیم پر ذرا بھی شاق نہیں گزرے گا، اس لیے کہ وہ جس طرح رحیم ہے، اسی طرح عادل بھی ہے اور یہ عدل بھی اس کی رحمت ہی کا تقاضا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۸۷)

[۷۸] بڑے گناہوں سے مراد وہ گناہ ہیں جو قرآن کے ان احکام عشرہ کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتے ہیں جو سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیات ۲۲-۳۹ میں مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ ان سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کا صلہ اس نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس کے بعد آدمی کے چھوٹے گناہوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمت سے معاف کر دیتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہاں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ صغائر سے بچنے کی راہ بھی یہی ہے کہ آدمی کبائر سے اجتناب کرے۔ جو آدمی اپنے ہزاروں کے قرضے چکاتا رہتا ہے، وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ کسی کے پانچ روپے دبا کر نادہند کہلانے کی ذلت گوارا کرے۔ برعکس اس کے جو لوگ کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں، لیکن چھوٹی چھوٹی نیکیوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، ان کا حال زندگی بھر یہ رہتا ہے کہ مچھر کو چھانتے رہتے ہیں اور اونٹ کو نگلتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو تو یہ زیرے اور سونف تک کی زکوٰۃ کا حساب سمجھاتے ہیں، لیکن خود یتیموں کے مال اور اوقاف کی آمدنیوں سے اپنی کوٹھیاں بنواتے اور ان کو سجاتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۸۸)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ، لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا
اكْتَسَبُوْا، وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ، وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ، اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ

اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے، اُس کی تمنا نہ کرو[79]۔ (اِس لیے کہ) مردوں نے جو کچھ کمایا ہے، (خدا کے حضور میں تو) اُس کا حصہ اُنھیں مل جائے گا اور عورتوں نے جو کچھ کمایا ہے، اُس کا حصہ اُنھیں مل جائے گا۔ (ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی تمنا ہو تو اِس میدان میں آگے بڑھو) اور (اِس کے لیے) اللہ سے اُس کے فضل کا حصہ مانگو۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے[80]۔ (یہی

---

[۷۹] یہ اس لیے فرمایا ہے کہ انسان کے لیے جدوجہد اور مسابقت کا اصلی میدان اس کی خلقی صفات نہیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ خلقی صفات کے لحاظ سے بعض کو بعض پر فی الواقع ترجیح حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو ذہنی، کسی کو جسمانی، کسی کو معاشی اور کسی کو معاشرتی برتری کے ساتھ پیدا کیا اور دوسروں کو اس کے مقابلے میں کم تر رکھا ہے۔ مرد و عورت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اس میں زوجین کا تعلق ایک کو فاعل اور دوسرے کو منفعل بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ فعلیت جس طرح غلبہ، شدت اور تحکم چاہتی ہے، انفعالیت اسی طرح نرمی، نزاکت اور اثر پذیری کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو ان میں سے ہر ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہے۔ ان میں اگر مسابقت اور تنافس کا رویہ اختیار کیا جائے گا تو یہ فطرت کے خلاف جنگ ہوگی جس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ بالآخر دونوں اپنی بربادی کا ماتم کرنے کے لیے باقی رہ جائیں۔

[۸۰] یہ ایک دوسرے میدان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ اکتسابی صفات، یعنی نیکی، تقویٰ، عبادت، ریاضت اور علم و اخلاق کا میدان ہے۔ قرآن نے اس کے لیے جگہ جگہ ایمان اور عمل صالح کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ مسابقت اور تنافس کا میدان درحقیقت یہی ہے۔ اس میں بڑھنے کے لیے کسی پر کوئی پابندی نہیں، بلکہ مسابقت اس میدان میں اتنی ہی محمود ہے، جتنی خلقی صفات کے میدان میں مذموم ہے۔ مرد بڑھے تو اسے بھی اپنی جدوجہد کا پھل ملے گا اور عورت بڑھے تو وہ بھی اپنی تگ و دو کا ثمرہ پائے گی۔ بانو، باندی، آزاد، غلام، شریف، وضیع، خوب صورت، بدصورت اور بینا و نابینا، سب کے لیے یہ میدان یکساں کھلا ہوا ہے۔ دوسروں پر فضیلت کی خواہش ہو تو انسان کو اس

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَالْاَقْرَبُوْنَ، وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ فَاٰتُوْھُمْ نَصِیْبَھُمْ، اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدًا﴿۳۳﴾

ترجیحات وراثت کی تقسیم میں بھی ملحوظ ہیں) اور والدین اور قرابت مندوں کے چھوڑے ہوئے مال میں سے (اِنھی کے مطابق) ہم نے ہر ایک کے لیے وارث ٹھیرا دیے ہیں۔ (اِن میں تبدیلی کی کوشش نہ کرو،) رہے وہ لوگ جن سے تمھارے عہد و پیمان ہوں تو اُن کا حصہ اُنھیں دو۔ (اِس میں، البتہ کسی حق دار کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں ہونا چاہیے،) اِس لیے کہ اللہ ہر چیز پر نگران ہے[81]۔ ۳۲-۳۳

میدان میں خدا کا فضل تلاش کرنے کے لیے نکلنا چاہیے۔ اپنی محنت غلط میدان میں برباد کرنے سے لاحاصل تصادم اور بے فائدہ تنازعات کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ حوصلہ آزمانے اور ارمان نکالنے کا صحیح میدان یہ ہے۔ جس کو اترنا ہو، وہ اس میدان میں اترے۔

[81] یہ تقسیم وراثت کے اس ضابطے کی طرف اشارہ ہے جو اس سے پہلے اسی سورہ میں بیان ہوا ہے۔ موقع کلام کی رعایت سے اس کا ذکر یہاں حصوں میں خدا کی قائم کی ہوئی ترجیحات کو بدلنے کی کوشش پر تنبیہ کے لیے ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اس حوالے سے مقصود اس کو مزید موکد کرنا ہے کہ ہر مورث کے جو وارث خدا نے ٹھہرا دیے ہیں، وہی اصلی وارث ہیں۔ اب ان میں اپنے ذاتی رجحانات کی بنا پر نہ کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجایش ہے اور نہ ان کے مقررہ حصوں میں کسی کمی بیشی کی۔ اگر کسی نے کسی غیر وارث سے کچھ دینے دلانے کا وعدہ کر رکھا ہے تو اس کو وہ حصہ دے جو اس کا ہے۔ 'اس کا حصہ' سے مراد، ظاہر ہے کہ وہی حصہ ہو سکتا ہے جس کی مورث کو وصیت کی اجازت ملی ہوئی ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تقسیم سے علیحدہ کر رکھا ہے۔ یہ حصہ درحقیقت ایسے ہی لوگوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھوڑا گیا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے 'نصیبھم' کا لفظ استعمال ہوا۔ آخر میں اپنی صفت 'علی کل شی ء شھیدا' کا حوالہ بطور تنبیہ دیا ہے کہ بے جا جانب داری کی مخفی سے مخفی کوشش بھی اللہ کے علم سے مخفی نہیں رہ سکتی۔ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ہر جلی و خفی سے آگاہ ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۸۹)

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

ایمانیات

(۱۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

نبی کی معرفت

نبی کی شخصیت انسانیت کا مظہر اتم اور اس کی دعوت انسان کی فطرت پر مبنی ہوتی ہے۔ تمام بھلائیوں کا سرچشمہ دو ہی چیزیں ہیں: ایک خدا کی یاد، دوسرے غریبوں کی ہمدردی۔ نبی خود بھی ان کا اہتمام کرتا اور دوسروں کو بھی انھی کی دعوت دیتا ہے۔ وہ لوگوں سے جو کچھ کہتا ہے، عقل و بصیرت کے آخری معیار پر کہتا ہے اور انھی چیزوں کے بارے میں کہتا ہے جن سے انسان غافل ہوتا یا انھیں بھلا بیٹھتا ہے۔ پھر اس کی نبوت کے پیچھے اخذ و اکتساب کا کوئی پس منظر بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کو پہچاننے میں کسی سلیم الفطرت شخص کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ انسان کے دل و دماغ بیدار ہوں تو روے و آواز پیمبر معجزہ ست:

قُلۡ: لَّوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوۡتُهٗ عَلَيۡكُمۡ وَلَآ اَدۡرٰكُمۡ بِهٖ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ. (یونس ۱۰:۱۶)

”کہہ دو کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ میں یہ قرآن تمھیں سناتا اور نہ وہ تمھیں اِس سے باخبر کرتا۔ (یہ اُسی کا فیصلہ ہے)، اِس لیے کہ میں تو ایک عمر تمھارے اندر گزار چکا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟“

تاہم اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کو ایسی بینات بھی عطا فرماتے ہیں کہ معاندین اگرچہ زبان سے اقرار نہ کریں،

لیکن اس کی صداقت پر یقین کے سوا ان کے لیے بھی کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ زمانۂ رسالت کے اہل کتاب سے متعلق قرآن نے اسی بنا پر ایک جگہ فرمایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی موت سے پہلے مان لے گا کہ پیغمبر کی بات ہی حق تھی۔[60] قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بینات ہر نبی کو اس کے زمانہ اور حالات کے لحاظ سے دی جاتی ہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔

۱۔ نبی بالعموم اپنے سے پہلے نبی کی پیشین گوئی کے مطابق اور اس کا مصداق بن کر آتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ کوئی اجنبی شخصیت نہیں ہوتا۔ لوگ اس سے متعارف بھی ہوتے ہیں اور اس کے منتظر بھی۔ مسیح علیہ السلام کے بارے میں صراحت ہے کہ سیدنا یحییٰ نے ان کی بعثت سے پہلے یروشلم میں ان کی منادی کی تھی۔[61] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت تورات وانجیل، دونوں میں بیان ہوئی ہے،[62] بلکہ سیدنا مسیح کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ نبی امی کی بشارت کے لیے آئے تھے۔[63] قرآن نے اپنی صداقت کے لیے اسے ایک برہان قاطع کی حیثیت سے پیش کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے علما اس کو اس طرح پہچانتے ہیں، جس طرح ایک مہجور باپ اپنے موعود و منتظر بیٹے کو پہچانتا ہے۔[64] اس کے معنی یہ تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خوب پہچانتے تھے:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ، عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ، بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ، وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ، اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ. (الشعراء ۲۶: ۱۹۲-۱۹۷)

”اور یہ نہایت اہتمام کے ساتھ عالم کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اسے روح الامین لے کر تمھارے قلب پر اترا ہے تاکہ تم لوگوں کو خبردار کرنے والے بنو، صاف عربی زبان میں۔ اور اس کا ذکر اگلوں کے صحیفوں میں بھی ہے۔ کیا ان کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علما اس کو جانتے ہیں؟“

۲۔ نبی جو کچھ خدا کی طرف سے اور خدا کے کلام کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، اس میں کوئی تضاد و تخالف نہیں

---

[60] النساء ۴: ۱۵۹۔

[61] آل عمران ۳: ۳۹۔

[62] الاعراف ۷: ۱۵۷۔

[63] الصف ۶۱: ۶۔

[64] الانعام ۶: ۲۰۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہوتا۔ دنیا میں آخری درجے کا کوئی عبقری بھی، خواہ وہ سقراط و فلاطون ہو یا کانٹ اور آئن اسٹائن، غالب و اقبال ہو یا رازی و زمخشری اپنی تخلیقات کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن قرآن نے یہ بات اپنے بارے میں کہی ہے اور پورے زور کے ساتھ کہی ہے کہ اس میں فکر و فلسفہ کے لحاظ سے کسی ادنیٰ تضاد اور اسلوب و انداز کے لحاظ سے کسی معمولی ارتقا یا تنزل کی نشان دہی بھی کوئی شخص نہیں کر سکتا:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْاٰنَ، وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافاً كَثِيرًا. (النساء ۴:۸۲)

''اور کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، اور (نہیں دیکھتے کہ) اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بڑے تضادات پاتے۔''

استاذ امام لکھتے ہیں:

''...قرآن کی ہر بات اپنے اصول اور فروع میں اتنی مستحکم اور مربوط ہے کہ ریاضی اور اقلیدس کے فارمولے بھی اتنے مستحکم و مربوط نہیں ہو سکتے۔ وہ جن عقائد کی تعلیم دیتا ہے، وہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ و پیوستہ ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی الگ کر دیجیے تو پورا سلسلہ ہی درہم برہم ہو جائے۔ وہ جن عبادات و طاعات کا حکم دیتا ہے، وہ عقائد سے اس طرح پیدا ہوتی ہیں، جس طرح تنے سے شاخیں پھوٹتی ہیں، وہ جن اعمال و اخلاق کی تلقین کرتا ہے، وہ اپنے اصول سے اس طرح ظہور میں آتے ہیں، جس طرح ایک شے سے اس کے قدرتی اور فطری لوازم ظہور میں آتے ہیں۔ اس کی مجموعی تعلیم سے زندگی کا جو نظام بنتا ہے، وہ ایک بنیان مرصوص کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی الگ کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ پوری عمارت میں خلا پیدا ہو جائے۔'' (تدبر قرآن ۲/۳۴۷)

۳۔ نبی کو اللہ تعالیٰ معجزات و خوارق عطا فرماتے ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا مسیح کو جو غیر معمولی معجزات دیے گئے، ان کے بارے میں خود قرآن نے صراحت فرمائی ہے کہ وہ جن چیزوں پر دلالت کے لیے دیے گئے، ان میں سے ایک ان نبیوں کی رسالت بھی تھی۔ چنانچہ عصاے موسوی اور ید بیضا کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے:

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهٖ، اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْماً فَاسِقِيْنَ. (القصص ۲۸:۳۲)

''سو یہ دو واضح نشانیاں ہیں فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس جانے کے لیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ نافرمان لوگ ہیں۔''

ان معجزات کو کوئی شخص سحر و ساحری یا علم و فن کا کمال کہہ کر رد نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اس طرح کے علوم و فنون کی حقیقت اس کے ماہرین سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا اور وہ بھی ان کے سامنے اعتراف عجز پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

موسیٰ علیہ السلام کے جن دو معجزات کا ذکر اوپر ہوا ہے، ان کا اثر مٹانے کے لیے فرعون نے یہی امتحان کیا تھا۔ قرآن کا بیان ہے کہ اس نے تمام مملکت میں ہرکارے بھیج کر ماہر جادوگر بلائے اور میلے کے دن انھیں مقابلے کے لیے پیش کر دیا۔ اس نے یہ اہتمام فتح کی توقع میں کیا تھا، لیکن ہوا یہ ہے کہ جادوگروں نے عصاے موسوی کو اپنا طلسم نگلتے دیکھا تو بے اختیار سجدہ ریز ہو گئے اور اعلان کر دیا کہ وہ موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ ایمان چونکہ حقیقت کو بچشم سر دیکھ لینے سے پیدا ہوا تھا، اس لیے ایسا راسخ تھا کہ فرعون نے جب انھیں دھمکی دی کہ میں تمھارے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دوں گا اور تمھیں کھجور کے تنوں پر سر عام سولی کے لیے لٹکا دوں گا تو وہی جادوگر جو چند لمحے پہلے بڑی لجاجت کے ساتھ اس سے انعام کی درخواست کر رہے تھے[۶۵]، پکار اٹھے کہ ماہ نخشب اور خورشید جہاں تاب کا یہ فرق دیکھ لینے کے بعد اب ہمیں کسی چیز کی کوئی پروا نہیں ہے:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ، وَالَّذِيْ فَطَرَنَا، فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ، اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا. اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا، وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ، وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى. (طٰہٰ ۲۰: ۷۲-۷۳)

”انھوں نے جواب دیا: ہم اُن روشن نشانیوں پر جو ہمارے پاس آئی ہیں اور اُس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے تم کو ہرگز ترجیح نہ دیں گے۔ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، کرو۔ تم زیادہ سے زیادہ اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتے ہو۔ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اس جادوگری سے، جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، درگزر فرمائے۔ اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معجزہ اس حیثیت سے دیا گیا، وہ قرآن ہے۔ عربی زبان کے اسالیب بلاغت اور علم و ادب کی روایت سے واقف ادبی ذوق کے حاملین اسے پڑھتے ہیں تو صاف محسوس کرتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک سے زیادہ مقامات پر اس نے خود اپنے مخاطبین کو چیلنج کیا ہے کہ وہ اسے خدا کا کلام نہیں مانتے تو اس کے مانند ایک سورہ ہی بنا کر پیش کر دیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا، فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ، وَادْعُوْا

”اور جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے، اُس کے بارے میں اگر تمھیں شبہ ہے تو (جاؤ اور)

۶۵؎ الاعراف ۷: ۱۱۳۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

شُهَدَآءَ كُم مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ، فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا، وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ، أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ.

(البقرہ۲: ۲۳-۲۴)

اِس کے مانند ایک سورہ ہی بنالاؤ، اور (اِس کے لیے) خدا کے سوا تمھارے جو زعما ہیں، انھیں بھی بلالو، اگر تم (اپنے اِس گمان میں) سچے ہو۔ پھر اگر نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن یہ لوگ بھی ہوں گے (جو نہیں مانتے) اور ان کے وہ پتھر بھی (جنھیں یہ پوجتے ہیں)۔ وہ اِنھی منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔‘‘

۴۔ اللہ تعالیٰ بعض ایسے امورغیب پر نبی کو مطلع کر دیتے ہیں جن کا جان لینا کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال وحی الٰہی کی پیشین گوئیاں ہیں جو حیرت انگیز طور پر بالکل صحیح ثابت ہوئیں۔ ان میں سے بعض قرآن میں ہیں اور بعض کا ذکر روایتوں میں ہوا ہے۔ سرزمین عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ، فتح مکہ اور لوگوں کے جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے کی پیشین گوئی ہم اس سے پہلے تمہیدی مباحث میں ’’تجرباتی شہادت‘‘ کے زیرعنوان بیان کر چکے ہیں۔ ایرانیوں سے مغلوب ہوجانے کے بعد رومیوں کی دوبارہ فتح کی پیشین گوئی بھی ایسی ہی غیرمعمولی تھی۔ قرآن مجید میں یہ اس طرح بیان ہوئی ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

غُلِبَتِ الرُّوْمُ، فِيْٓ أَدْنَى الْأَرْضِ، وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ، فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ، لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ، وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ، بِنَصْرِ اللّٰهِ، يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ، وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ، وَعْدَ اللّٰهِ، لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ، وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ.

(الروم۳۰: ۲-۶)

’’رومی قریب کے علاقے میں مغلوب ہوگئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد وہ چند سال کے اندر غالب ہو جائیں گے۔ اللہ ہی کے حکم سے ہوا ہے جو پہلے ہوا اور جو بعد میں ہوگا، وہ بھی اللہ کے حکم سے ہوگا۔ اور اُس دن مسلمان خوشیاں منائیں گے، اللہ کی مدد سے۔ وہ جس کی چاہتا ہے، مدد فرماتا ہے، اور وہ زبردست ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔‘‘

یہ پیشین گوئی جب کی گئی تو ’’زوال روما‘‘ کے مصنف ایڈورڈ گبن کے الفاظ میں: ’’کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از وقوع نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے کہ ہرقل کے پہلے بارہ سال رومی سلطنت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے[۶۶]‘‘، لیکن یہ

ٹھیک اپنے وقت پر پوری ہوگئی اور مارچ ۶۲۸ میں رومی حکمران اس شان سے قسطنطنیہ واپس آیا کہ اس کے رتھ کو چار ہاتھی کھینچ رہے تھے اور بے شمار لوگ دارالسلطنت کے باہر چراغ اور زیتون کی شاخیں لیے اپنے ہیرو کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

۵۔ نبیوں میں سے جو رسول کے منصب پر فائز ہوتے ہیں، وہ خدا کی عدالت بن کر آتے اور اپنی قوم کا فیصلہ کر کے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ اس کی صورت ہم اس سے پہلے تمہیدی مباحث میں بیان کر چکے ہیں کہ اللہ کے یہ پیغمبر اپنے پروردگار کے میثاق پر قائم رہتے ہیں تو اس کی جزا اور اس سے انحراف کرتے ہیں تو اس کی سزا انھیں دنیا ہی میں مل جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا ان کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو ان کی قوموں کے لیے دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان رسولوں کو غلبہ عطا فرماتے اور ان کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ، فَإِذَا جَآءَ رَسُولُهُمْ، قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ، وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ. (یونس ۱۰: ۴۷)

”اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا وہ رسول آ جائے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے، اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔“

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۶۶؎ زوال روما ۴۷۔

حافظ محمد زبیر

مسجد اقصیٰ کی تولیت

قرآن وسنت کی روشنی میں ایک تاریخی و تحقیقی جائزہ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''المورد'' کے اسسٹنٹ فیلو اور ماہنامہ ''الشریعہ'' کے مدیر جناب محمد عمار خان ناصر صاحب کی طرف سے ماہنامہ ''اشراق'' جولائی و اگست ۲۰۰۳ میں ''مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون شائع ہوا۔ چونکہ محترم عمار صاحب نے اپنے اس مضمون میں امت مسلمہ کے عام موقف کے بالکل برعکس ایک نئی رائے کا اظہار کیا تھا، اس لیے مختلف علمی حلقوں کی طرف سے ان کو مختلف قسم کی علمی اور جذباتی تنقیدی آرا کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ عمار صاحب نے ماہنامہ ''اشراق'' مئی و جولائی ۲۰۰۴ کے شماروں میں ان تمام تنقیدی آرا کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہمارے علم کی حد تک کسی ناقد نے بھی عمار صاحب کی اس اصولی غلطی کی نشان دہی نہیں کی جو ان کے مضمون کی کل بنیاد ہے۔ عمار صاحب کے اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تولیت کا شرعی حق یہود کو حاصل ہے، اگرچہ تکوینی طور پر یہ مسجد سینکڑوں سال سے مسلمانوں کی تولیت میں ہے۔ مسجد اقصیٰ کی تولیت پر یہود کے شرعی حق کی کل دلیل، عمار صاحب کے نزدیک وہ اسرائیلیات ہیں جن کو وہ کتاب مقدس کے بیانات کہتے ہیں۔ ان اسرائیلی روایات سے محترم عمار صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسجد اقصیٰ یعنی ہیکل سلیمانی کو حضرت سلیمان نے اپنے زمانے میں جنات سے تعمیر کرایا تھا۔ یہ ہیکل یہودیوں کا قبلہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ ان کا مقام حج ہے۔ یہی ان کی قربان گاہ

اورمرکزعبادت ہے۔اس کی طرف رخ کر کے وہ نماز ادا کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ نظریہ ہی غلط ہے کہ مسجد اقصیٰ یہودیوں کا قبلہ یا مقام حج یا نماز کے لیے ایک سمت ہے۔قرآن وسنت تو کیا،کسی ایک اسرائیلی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ بیت المقدس کو اللہ تعالیٰ نے یہود کا قبلہ مقرر کیا تھا۔حق بات یہ ہے کہ حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیا کا قبلہ ''مسجد حرام'' رہا ہے۔تمام انبیا مسجد حرام کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے ہیں اور یہیں آ کر فریضۂ حج ادا کرتے رہے ہیں۔مسجد اقصیٰ کو اپنا قبلہ قرار دینا یہودیوں اور عیسائیوں کی اپنے دین میں اختراع ہے۔مسجد اقصیٰ کی حیثیت مسلمانوں کے ایک بابرکت مقام اور مسجد کی سی ہے۔مسجد اقصیٰ یہودیوں کی نہیں، بلکہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے، اس لیے اس کی تولیت کا حق بھی مسلمانوں ہی کو حاصل ہے۔ مسجد اقصیٰ کا مسئلہ چونکہ ایک اصولی مسئلہ ہے،اس لیے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس پر اصولی انداز میں بحث ہونی چاہیے۔ عمار صاحب سے اس مسئلے کی تحقیق میں جو بنیادی غلطی ہوئی، وہ یہ کہ انھوں نے اسرائیلیات کی روشنی میں قرآن وسنت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے[۱]۔ اگر وہ قرآن وسنت کی روشنی میں اسرائیلی روایات کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو ان کے نتائج اس سے بہت مختلف ہوتے جو کہ وہ بیان کر رہے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کی فضیلت

مسجد اقصیٰ کے درج ذیل فضائل قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں:

۱۔مسجد اقصیٰ بابرکت زمین میں ہے:

قرآن میں چار مقامات پر سرزمین شام کو بابرکت زمین کہا گیا ہے۔نزول قرآن کے وقت ملک شام، موجودہ شام سے بہت وسیع تھا۔موجودہ فلسطین بھی اس کا ایک حصہ تھا۔مسجد اقصیٰ شام کی اسی بابرکت سرزمین میں واقع ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا. (الاعراف ۷:۱۳۷)

''اور ہم نے اس قوم کو کہ جس کو کمزور بنایا گیا تھا، اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنایا کہ جس سرزمین میں ہم نے برکت رکھ دی ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں حضرت سلیمان کے دور میں موجود بنی اسرائیل کی اس عظیم سلطنت کی طرف اشارہ

۱؎ محترم عمار صاحب نے تحقیق کا یہ انداز واسلوب جناب غامدی صاحب سے سیکھا ہے۔غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''میزان'' میں تفصیل سے اپنے اس اصول کو بیان کیا ہے کہ قرآن کو سابقہ صحف سماویہ کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہے جو کہ اس زمانے کے شام اور اس کے گردونواح پر مشتمل تھی۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَنَجَّیْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ. (الانبیاء۲۱:۷۱)

''اور ہم نے اس کو (یعنی حضرت ابراہیم) اور حضرت لوط کو نجات دی ایک ایسی سرزمین کی طرف کہ جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لیے برکت رکھ دی ہے۔''

اس آیت مبارکہ کے الفاظ 'العالمین' سے واضح ہوتا ہے کہ سرزمین فلسطین وشام کی برکات کسی خاص جماعت، قوم یا مذہب کے ماننے والوں کے لیے نہیں ہیں، جیسا کہ یہودیوں کا یہ خیال ہے کہ اس سرزمین کی برکات ان کے لیے مخصوص ہیں، بلکہ اس سرزمین کی برکت تمام اقوام، مذاہب اور جماعتوں کے لیے ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا. (الانبیاء۲۱:۸۱)

''اور حضرت سلیمان کے لیے ہم نے تیز وتند ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی کہ جس میں ہم نے برکت رکھ دی ہے۔''

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ جَعَلْنَا بَیْنَهُمْ وَ بَیْنَ الْقُرَی الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا قُرًی ظَاهِرَةً. (سبا۳۴:۱۸)

''اور ہم نے ان (یعنی قوم سبا) کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان کہ جن میں ہم نے برکت رکھ دی ہے، کچھ نمایاں بستیاں بنائی تھیں۔''

اس آیت مبارکہ کے الفاظ 'القری' سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ برکت صرف فلسطین کی بستی میں نہیں رکھی گئی، بلکہ ان تمام بستیوں میں رکھی گئی ہے جو کہ سرزمین شام پر واقع ہیں۔

۲۔ مسجد اقصیٰ کے اردگرد کی سرزمین بھی بابرکت ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ. (الاسراء۱۷:۱)

''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو ایک رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کہ جس کے اردگرد ہم نے برکت رکھ دی ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے ساتھ ساتھ اس کے ارد گرد کی سرزمین یعنی فلسطین و شام کا علاقہ بھی بابرکت ہے۔

۳۔ مسجد اقصیٰ ارض مقدسہ میں ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَۃَ الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ. (المائدہ۵:۲۱)

''اے میری قوم کے لوگو، داخل ہو جاؤ اس مقدس سرزمین میں کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے۔''

قتادہ کے نزدیک ارض مقدسہ سے مراد ''شام'' ہے، جبکہ مجاہد اور ابن عباس کے ایک قول کے مطابق ''کوہ طور اور اس کے ارد گرد کا علاقہ'' مراد ہے۔ اسی طرح سدی اور ابن عباس کے دوسرے قول کے مطابق اس سے مراد ''اُریحا'' ہے۔ زجاج نے کہا کہ اس سے مراد ''دمشق اور فلسطین'' ہے۔ بعض مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ اس سے مراد ''اردن کا علاقہ'' ہے۔ امام قرطبی اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ قتادہ کا قول سب کو شامل ہے۔ امام قرطبی کے اس قول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شام میں فلسطین، دمشق اور اردن کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اسی طرح کوہ طور اور اس کے ارد گرد کا علاقہ حتیٰ کہ اُریحا کا شہر بھی شام کی بابرکت سرزمین کی حدود میں تھا۔

۴۔ بیت اللہ کے بعد دوسری مسجد:

مسجد اقصیٰ روے زمین پر بیت اللہ کے بعد دوسری مسجد ہے کہ جس کو عبادت الٰہی کے لیے تعمیر کیا گیا۔ حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہے:

سألت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن أول مسجد وضع فی الأرض قال المسجد الحرام قلت ثم أی قال المسجد الأقصی قلت کم بینهما قال أربعون عاما[۲].

''میں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اس روے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر کی گئی؟ آپ نے جواب دیا: مسجد حرام۔ میں نے پھر سوال کیا: اس کے بعد کون سی مسجد تعمیر کی گئی تو آپ نے فرمایا: مسجد اقصیٰ۔ میں نے کہا: ان دونوں کی تعمیر کے دوران میں کل کتنا وقفہ ہے تو آپ نے کہا: چالیس سال۔''

۲؎ سنن نسائی: کتاب المساجد، باب: ذکر أی مسجد وضع أولا۔

۵۔ مسجد اقصیٰ کی طرف شد رحال کی مشروعیت:

مسجد اقصیٰ ان تین مساجد میں شامل ہے کہ جن کا تبرک حاصل کرنے کے لیے یا ان میں نماز پڑھنے کے لیے یا ان کی زیارت کے لیے سفر کو مشروع قرار دیا گیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد مسجدی هذا و مسجد الحرام والمسجد الأقصی۔[۳]

''تین مساجد کے علاوہ کسی جگہ کا قصد کر کے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ میری اس مسجد کا یعنی مسجد نبوی کا، مسجد حرام کا اور مسجد اقصیٰ کا۔''

۶۔ مسجد اقصیٰ کو انبیا نے تعمیر کیا:

مسجد اقصیٰ ان مساجد میں سے ہے کہ جس کو جلیل القدر انبیا نے تعمیر کیا۔ طبرانی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

أن داؤد ابتدأ ببناء البیت المقدس ثم أوحی اللّٰه الیه انی لأقضی بناؤه علی ید سلیمان۔[۴]

''حضرت داؤد نے بیت المقدس کی تعمیر کے لیے بنیادیں رکھیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت سلیمان کے ہاتھوں مکمل کراؤں گا۔''

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

أن سلیمان بن داؤد لما بنی بیت المقدس سال اللّٰه عز وجل خلالا ثلاثة ... سأل اللّٰه عز وجل حین فرغ من بناء المسجد أن لا یاتیه أحد لا ینهزه الا الصلاة فیه أن یخرجه من خطیئته کیوم ولدته أمه۔[۵]

''حضرت سلیمان نے جب بیت المقدس کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کی دعا کی ... جب وہ مسجد بنا کر فارغ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ جب بھی کوئی شخص اس مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے آئے تو وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو کر نکلے جیسے کہ اس کی ماں نے اس کو جنا ہو۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۷۔ مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی فضیلت:

صحیح حدیث میں مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی بہت زیادہ فضیلت بیان ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو اللہ کے

۳۔ صحیح بخاری: کتاب الجمعہ، باب: فضل الصلاة فی مسجد مکة و المدینة۔

۴۔ فتح الباری مع صحیح بخاری: کتاب أحادیث الأنبیاء، باب: قول اللّٰه تعالی و اتخذ اللّٰه ابراهیم خلیلا۔

۵۔ سنن نسائی: کتاب المساجد، باب: فضل المسجد الأقصی و الصلاة فیه۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

أن سليمان بن داؤد لما بنى بيت المقدس سال الله عز وجل خلالا ثلاثة ... سأل الله عز وجل حين فرغ من بناء المسجد أن لا ياتيه أحد لا ينهزه الا الصلاة فيه أن يخرجه من خطيئته كيوم ولدته أمه[6].

''حضرت سلیمان نے جب بیت المقدس کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کی دعا کی ...جب وہ مسجد بنا کر فارغ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ جب بھی کوئی شخص اس مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے آئے تو وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو کر نکلے جیسے کہ اس کی ماں نے اس کو جنا ہو۔''

۸۔ مسجد اقصیٰ سے احرام باندھ کر حج کرنے کی فضیلت:

مسجد اقصیٰ سے حج یا عمرہ کے لیے احرام باندھ کر مسجد حرام کی طرف نکلنے کی بہت زیادہ فضیلت حدیث میں آئی ہے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ آپ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا:

من أهل بحجة أو عمرة من المسجد الأقصى الى المسجد الحرام غفر له ما تقدم من ذنبه وما تأخر أو وجبت له الجنة شك عبدالله أيتهما قال[7].

''جس نے بھی مسجد اقصیٰ سے مسجد حرام تک کے لیے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھا، اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے یا اس کے لیے جنت واجب ہو جائے گی۔ عبداللہ کو شک گزرا کہ آپ نے ان دونوں میں سے کون سے الفاظ فرمائے ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۹۔ مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی نذر ماننا جائز ہے:

فتح مکہ کے موقع پر ایک شخص نے آپ سے آ کر سوال کیا:

يا رسول الله انى نذرت لله ان فتح الله عليك مكة ان أصلى فى بيت المقدس ركعتين قال صل هاهنا ثم أعاد عليه فقال صل هاهنا ثم أعاد عليه فقال صل هاهنا ثم أعاد عليه فقال شانك[8].

''اے اللہ کے رسول، میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں مکہ فتح کروا دیا تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز پڑھوں گا۔ آپ نے فرمایا: یہاں ہی پڑھ لے۔ اس نے پھر آپ کے سامنے اپنی بات کو دہرایا۔ آپ نے فرمایا: یہاں نماز پڑھ لے۔ اس نے پھر اپنی بات کو دہرایا تو آپ نے

۶؎ ایضاً۔

۷؎ سنن ابی داؤد: کتاب المناسک، باب: فی المواقیت۔

فرمایا: تمھارا معاملہ ہے (یعنی جہاں تو چاہے پڑھ لے، میں نے تو تیری آسانی کی خاطر تجھے یہ مشورہ دیا تھا)۔‘‘[8]

اس کے علاوہ بھی روایات ہیں کہ جن سے مسجد اقصیٰ کی برکت وفضیلت کا اظہار ہوتا ہے، لیکن طوالت کے خوف سے ہم صرف انھی روایات پر اکتفا کرتے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کی تعمیر و تاریخ

محترم عمار صاحب نے اپنے مضمون میں مسجد اقصیٰ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اپنی تحقیق کی کل بنیاد اسرائیلی روایات کو بنایا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث کہ جس میں مسجد اقصیٰ کی پہلی تعمیر کا تذکرہ ہے، اس کو حاشیہ میں بیان کیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عمار صاحب کی اس نادر تحقیق کے اصل اور فیصلہ کن مصادر کون سے ہیں؟

قرآن وسنت کی روشنی میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر و تاریخ کا تعین کرنے میں حضرت ابوذر غفاری کی درج ذیل روایت کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ حضرت ابوذر سے روایت ہے:

سألت رسول الله صلى اللّٰه عليه وسلم عن أول مسجد وضع فى الأرض، قال المسجد الحرام، قلت ثم أى؟ قال المسجد الأقصى، قلت كم بينهما قال أربعون عاما.[9]

’’میں نے کہا: اے اللہ کے رسول، اس روے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر کی گئی؟ آپ نے جواب دیا: مسجد حرام۔ میں نے پھر سوال کیا: اس کے بعد کون سی مسجد تعمیر کی گئی؟ آپ نے فرمایا: مسجد اقصیٰ۔ میں نے کہا: ان دونوں کی تعمیر کے دوران میں کل کتنا وقفہ ہے؟ آپ نے کہا: چالیس سال۔‘‘

اس روایت سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ اس زمین پر سب سے پہلی مسجد جو کہ اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کی گئی، مسجد حرام ہے۔

۲۔ دوسری مسجد جو کہ اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کی گئی، مسجد اقصیٰ ہے۔

۸؎ سنن ابی داوٗد: کتاب الایمان والنذور، باب: من نذر أن يصلى فى بيت المقدس۔

۹؎ صحیح مسلم: کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۳۔ان دونوں مساجد کی تعمیر کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کس دور میں ہوئی؟ اگر بیت اللہ کی تعمیر کا زمانہ متعین ہو جائے تو مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا زمانہ از خود متعین ہو جائے گا، کیونکہ صحیح حدیث کے مطابق مسجد اقصیٰ کی تعمیر بیت اللہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد ہوئی۔ بیت اللہ کی تعمیر کے بارے میں آرا مختلف ہیں جن میں سے دو ہی آرا دلائل کی روشنی میں قوی ہیں:

الف۔ایک رائے یہ ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی تعمیر حضرت ابراہیم کے زمانے میں ہوئی تھی۔قرآنی نص سے یہ بات ثابت ہے کہ بیت اللہ کو حضرت ابراہیم نے تعمیر کیا تھا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ يَـرْفَـعُ اِبْـرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ. (البقرہ۲:۱۲۷)

''اور جب حضرت ابراہیم بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور حضرت اسمٰعیل بھی۔''

اگر ہم حضرت ابراہیم کی اس تعمیر کو بیت اللہ کی پہلی تعمیر مانیں تو مسجد اقصیٰ کے پہلے موسس حضرت ابراہیم ہوں گے۔

ب۔دوسری رائے یہ ہے کہ بیت اللہ کی پہلی تعمیر حضرت آدم کے زمانے میں ہوئی۔اگر اس قول کو صحیح مانیں تو مسجد اقصیٰ کے موسس حضرت آدم قرار پائیں گے۔ہمارے نزدیک صحیح قول یہی ہے کہ بیت اللہ کی پہلی تعمیر حضرت آدم نے کی۔حضرت ابراہیم نے آکر اس کی تجدید کی ہے۔ہماری اس رائے کی بنیاد درج ذیل دلائل پر ہے:

۱۔اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا کے لیے نماز کو مشروع قرار دیا تھا جس کے لیے ایک قبلہ کا ہونا ضروری تھا۔لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ حضرت آدم کے دین میں نماز کا مشروع ہونا، اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے لیے حضرت آدم کوئی قبلہ بھی تعمیر کریں۔

۲۔اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ حضرت ابراہیم نے سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر کی تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس بات کا بھی اقرار کیا جائے کہ حضرت ابراہیم سے ماقبل اسلامی شریعتوں میں حج کا کوئی تصور نہ تھا جو کہ غلط ہے۔لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم سے پہلے مختلف انبیا کے ہاں حج کا تصور اس بات کو ملتزم ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے ایک قبلے کا وجود مانا جائے۔

۳۔حضرت ابراہیم جب حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کو سرزمین مکہ میں آباد کرنے کے لیے وہاں چھوڑنے گئے تو اس وقت انھوں نے دعا مانگی جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ . (ابراہیم ۱۴: ۳۷)

''اے میرے پروردگار، بے شک میں نے اپنی اولاد کو آباد کیا، ایک ایسی سرزمین میں جو کہ کھیتی والی نہیں ہے، تیرے حرمت والے گھر کے پاس۔''

اس دعا کے الفاظ 'عند بیتك المحرم' سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی اس دعا کے وقت بیت اللہ کی بنیادیں موجود تھیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم سے پہلے بھی تعمیر ہو چکا تھا۔

۴۔ اس قرآنی موقف کے شواہد بعض ضعیف روایات سے بھی ہمیں ملتے ہیں، مثلاً امام بیہقی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں:

بعث اللّٰه جبرئیل الی آدم و حواء فأمرهما ببناء الكعبة فبناه آدم ثم أمر بالطواف به و قيل له أنت أول الناس وهذا أول بيت وضع للناس[۱۰].

''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کو حضرت آدم و حوا کی طرف بھیجا اور ان کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ حضرت آدم نے بیت اللہ کو تعمیر کیا، پھر حضرت آدم کو بیت اللہ کا طواف کرنے کا حکم دیا اور حضرت آدم سے کہا گیا کہ تو پہلا آدمی ہے اور یہ پہلا گھر ہے جو کہ لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے۔''

۵۔ علامہ ابن حجر نے بھی اسی رائے کو ایک روایت کی بنیاد پر ترجیح دی ہے۔ ابن حجر لکھتے ہیں:

و يؤيد قول من قال: أن آدم هو الذى أسس كلا من المسجدين فذكر ابن هشام فى كتاب التيجان أن آدم لما بنى الكعبة أمره اللّٰه بالسير الى بيت المقدس وأن يبنيه فبناه و نسك فيه وبناء آدم للبيت مشهور وقد تقدم قريبا حديث عبد اللّٰه بن عمرو أن البيت رفع زمن الطوفان حتى بواه اللّٰه لابراهيم[۱۱].

''اور ان لوگوں کے قول کی تائید جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت آدم نے مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ، دونوں کو تعمیر کیا، اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو ابن ہشام نے کتاب التیجان میں نقل کیا ہے کہ حضرت آدم نے جب بیت اللہ کو تعمیر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ وہ بیت المقدس کی طرف جائیں اور اس کی بنیاد رکھیں تو انھوں نے جا کر اس کو تعمیر کیا۔ اور بیت اللہ کی جو تعمیر حضرت آدم کے ہاتھوں ہوئی، وہ معروف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث پہلے گزر چکی

۱۰؎ دلائل النبوہ، امام بیہقی ۲/ ۴۵۔ و رواه ابن كثير فى تفسيره و اللفظ له ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہے کہ بیت اللہ کو طوفان نوح کے دوران میں اٹھا لیا گیا تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کو حضرت ابراہیم کا ٹھکانا بنایا۔''

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی طرح مسجد اقصیٰ کی بھی کئی دفعہ تعمیر ہوئی۔ طبرانی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

أن داؤد ابتدأ ببناء البيت المقدس ثم أوحى اللّٰه اليه انى لأقضى بناؤه على يد سليمان.[12]

''حضرت داؤد نے بیت المقدس کی تعمیر کے لیے بنیادیں رکھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت سلیمان کے ہاتھوں مکمل کراؤں گا۔''

اسی طرح نسائی کی ایک روایت ہے:

أن سليمان بن داؤد لما بنى بيت المقدس سأل اللّٰه عزوجل خلالا ثلاثه.[13]

''جب حضرت سلیمان نے بیت المقدس کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کی دعا کی۔''

ان روایات میں مسجد اقصیٰ کی پہلی تعمیر کے علاوہ، جو کہ حضرت آدم نے کی تھی، ایک دوسری تعمیر کا بھی تذکرہ ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان کے درمیان زمانی وقفہ ایک تاریخی روایت کے مطابق تین ہزار سال جبکہ دوسری روایت کے مطابق ڈیڑھ ہزار سال ہے۔

ج۔ ایک تیسری رائے جو کہ محترم عمار صاحب نے حدیث ابوذر کے حوالے سے اپنے مضمون کے حاشیے میں بیان کی ہے۔ عمار صاحب لکھتے ہیں:

''اس روایت پر یہ اشکال ہے کہ تاریخ کے مسلمات کی رو سے مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی اور ان کے اور سیدنا ابراہیم علیہما السلام کے مابین، جو مسجد حرام کے معمار تھے، کئی صدیوں کا فاصلہ ہے، جبکہ روایت میں دونوں مسجدوں کی تعمیر کے درمیان صرف چالیس سال کا فاصلہ بتایا گیا ہے۔ علماے حدیث کے

---

[11] صحیح بخاری مع فتح الباری: کتاب احادیث الانبیاء، باب: قول اللّٰه تعالیٰ و اتخذ اللّٰه ابراهيم خليلا۔

[12] فتح الباری مع صحیح بخاری: کتاب احادیث الانبیاء، باب: قول اللّٰه تعالیٰ و اتخذ اللّٰه ابراهيم خليلا۔

[13] سنن نسائی: کتاب المساجد، باب: فضل المسجد الأقصى و الصلاة فيه۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کے مقام کی تعیین تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرما دی تھی اور مذکورہ روایت میں اسی کا ذکر ہے، جبکہ حضرت سلیمان نے صدیوں بعد اسی جگہ پر ہیکل سلیمانی کو تعمیر کیا۔اس لحاظ سے ان کی حیثیت ہیکل کے اولین بانی اور موسس کی نہیں، بلکہ تجدید کنندہ کی ہے۔[14]''

محترم عمار صاحب نے اس رائے کی نسبت علماے حدیث کی طرف کی ہے، حالانکہ علماے حدیث میں سے کسی ایک کی بھی یہ رائے نہیں ہے جو کہ عمار صاحب بیان کر رہے ہیں۔ یہ عمار صاحب کی اپنی رائے ہے کہ جس کی نسبت انھوں نے علماے محدثین کی طرف کر دی ہے اور جن کتابوں کے وہ حوالے دے رہے ہیں، ان میں یہ بات اس طرح موجود نہیں ہے جس طرح کہ وہ اس کو بیان کر رہے ہیں۔

عمار صاحب سے پہلی غلطی تو یہ ہوئی کہ انھوں نے اس رائے کی نسبت علماے محدثین کی طرف کر دی، حالانکہ یہ رائے صرف ابن قیم اور ابن کثیر کی ہے۔کیا دو پر جمع کا اطلاق ہوتا ہے؟

دوسری غلطی عمار صاحب نے یہ کی کہ جب دیکھا کہ مسئلہ حدیث کا ہے تو ابن قیم اور ابن کثیر کو علماے محدثین بنا کر پیش کر دیا، حالانکہ مقدم الذکر کا اصل میدان عقیدہ وفقہ ہے اور موخر الذکر کا تفسیر و تاریخ۔ان میں سے کوئی ایک بھی علما میں بطور محدث اس طرح معروف نہیں ہے جس طرح مولفین صحاح ستہ یا ان کے اساتذہ وغیرہ۔

عمار صاحب سے تیسری غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ابن قیم اور ابن کثیر کی رائے کو بھی ان حضرات کے اپنے الفاظ میں پیش نہیں کیا۔ابن قیم نے اپنی رائے بیان کرتے ہوئے جو الفاظ بیان کیے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

والذی أسسه هو یعقوب ابن اسحاق.[15]

جبکہ ابن کثیر نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں:

وان أول من جعله مسجدا اسرائیل علیه السلام.[16]

جبکہ محترم عمار صاحب نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

''علماے حدیث کے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کے مقام کی تعیین تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرما دی تھی۔[17]''

---

[14] ماہنامہ ''اشراق''، جولائی ۲۰۰۳، ۳۶۔

[15] زاد المعاد، امام ابن قیم، ۹۔

[16] قصص النبیین، امام ابن کثیر ۱/ ۱۶۶۔

[17] ماہنامہ ''اشراق''، جولائی ۲۰۰۳، ۳۶۔

محترم عمار صاحب نے امام ابن قیم کے الفاظ 'أسس' اور امام ابن کثیر کے الفاظ 'جعل' کا ترجمہ ''تعین کرنا'' کیا ہے۔ اس کو ان جلیل القدر علما کی آرا میں تحریف نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟

چوتھی غلطی عمار صاحب سے یہ ہوئی کہ انھوں نے حدیث میں موجود الفاظ 'وضع' کو نظر انداز کر دیا جس کا معنی لغت میں ''تعین کرنا'' نہیں ہوتا۔ امام ابن قیم اور امام ابن کثیر جیسے علما کے یہ شایان شان نہیں ہے کہ ان کی طرف اس بات کی نسبت کی جائے کہ انھوں نے حدیث میں وارد شدہ الفاظ 'وضع' سے مراد بیت المقدس کی ''تعیین'' لی ہے۔

عمار صاحب کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بیت المقدس کی تعمیر پہلی دفعہ حضرت سلیمان نے ہی کی اور وہ یہ عزم کیے ہوئے ہیں کہ کسی طرح بیت المقدس کی تعمیر کے بارے میں وارد شدہ اسرائیلی روایات، کہ جن پر انھوں نے اپنے موقف کی بنیاد رکھی ہے، کو صحیح ثابت کر دیا جائے، چاہے انھیں اس کے لیے صحیح احادیث کی من گھڑت تاویل اور علماے سلف کی آرا میں تحریف ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ ہمارے ''تحریف'' کے الفاظ شاید عمار صاحب کو ناگوار گزریں، لیکن انھوں نے اپنے مضمون میں مسجد اقصیٰ کے حوالے سے علما کے عمومی موقف کے بارے میں جس قدر سخت لب ولہجہ اور اسلوب اختیار کیا ہے، اس کی بھی ایک جھلک ذرا قارئین ملاحظہ فرما لیں۔ عمار صاحب لکھتے ہیں:

''یہ نکتہ اب اہل علم کے لیے ایک کھلے سوال کی حیثیت رکھتا ہے کہ عالم عرب کا یہ کم وبیش اجماعی موقف، جس کو متعدد اکابر علماے دین ومفتیان شرع متین کی تائید ونصرت حاصل ہے اور جس کو مسلم اور عرب میڈیا تسلسل کے ساتھ دہرا رہا ہے، کتمان حق اور تکذیب آیات اللہ کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں؟''[18]

عمار صاحب اپنے ایک اجتہادی موقف پر اس قدر مصر ہیں کہ علما کے کم وبیش اجماع کو کتمان حق اور تکذیب آیات اللہ سے تعبیر کر رہے ہیں۔ عمار صاحب مذکورہ بالا عبارت میں جو سوال اہل علم سے کر رہے ہیں، وہی سوال اگر وہ اپنے آپ سے بھی کر لیتے تو ان کو اس کا جواب مل جاتا۔ عمار صاحب مولانا وحید الدین خان صاحب پر تنقید کرتے ہوئے ماہنامہ ''الشریعہ'' میں لکھتے ہیں:

''مولانا کے زاویۂ نگاہ سے اصولی طور پر اتفاق رکھنے والے اہل فکر کا ایک حلقہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مخالف فکری زاویوں اور شخصیات پر تنقید کے لیے ان کا اختیار کردہ لب ولہجہ اور اسلوب 'رأیی صواب یحتمل الخطا و رأیھم خطا یحتمل الصواب' کے ذہنی رویے کے بجائے حتمیت کی عکاسی کرتا ہے اور وہ اپنے زاویۂ نگاہ کو

18؎ ماہنامہ ''اشراق''، جولائی ۲۰۰۳، ۴۱۔

ایک نقطۂ نظر سمجھنے کے بجائے ''واحد درست طرز فکر'' قرار دینے میں حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں[19]۔''

ایک اور جگہ ماہنامہ ''اشراق''، جنوری ۲۰۰۷، صفحہ ۷۱ پر محترم عمار صاحب لکھتے ہیں:

''اگر علمی مباحث میں طعن و تشنیع اور تفسیق و تضلیل کا رویہ در آئے تو تنقید فکر و نظر کی آبیاری کرنے کے بجائے محض 'بغیا بینھم' کا ایک نمونہ بن کر رہ جاتی ہے۔''

ہم عمار صاحب سے سوال کرتے ہیں، کیا یہ اصول تنقید صرف ان کے لیے ہے جو آپ یا آپ کی طرح کے آزاد خیال مفکرین کی آرا پر تنقید کرنا چاہے یا آپ کو بھی علما کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنے قلم کو لگام دینی چاہیے؟

بہر حال خلاصۂ کلام یہ کہ مذکورہ بالا بحث سے درج ذیل نتائج ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ، دونوں کے موسس حضرت آدم ہیں۔

۲۔ ظاہر نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد حرام کی دوسری تعمیر حضرت ابراہیم کے ہاتھوں ہوئی، جبکہ مسجد اقصیٰ کی دوسری تعمیر کی بنیاد حضرت داؤد نے رکھی اور مکمل حضرت سلیمان کے عہد میں ہوئی۔ اس عرصے کے درمیان میں کسی اور تعمیر کا تذکرہ صحیح نصوص میں نہیں ملتا۔

یہ تو مسجد اقصیٰ کے حوالے سے ہماری کچھ ضمناً گفتگو تھی، جس کا مقصد عمار صاحب کے مضمون سے پیدا شدہ ایک غلط فہمی کا ازالہ تھا۔ اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مسجد اقصیٰ کی تولیت مسلمانوں کا حق ہے

مسجد اقصیٰ کی تولیت مسلمانوں کا شرعی حق ہے جس کے درج ذیل دلائل ہیں:

۱۔ مسجد اقصیٰ کی تعمیر مسلمان انبیا نے کی:

مسجد اقصیٰ کی تعمیر مسلمان انبیا کے ہاتھوں ہوئی۔ سب سے پہلے اسے حضرت آدم نے تعمیر کیا جو کہ مسلمان تھے۔ اس کے بعد حضرت داؤد نے اس کی بنیاد رکھی۔ پھر حضرت سلیمان نے اس کو مکمل کیا۔ اس لیے اس مسجد پر اسی قوم کا حق ہے جو کہ مسلمان ہو۔ جب تک عیسائی اور یہودی مسلمان تھے، اس وقت تک اس عبادت گاہ پر ان کا حق قائم تھا، لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد جو بھی یہودی اور عیسائی آپ پر ایمان نہیں لاتا، وہ کافر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۱۹؎ ماہنامہ ''الشریعہ'' اکتوبر ۲۰۰۶، ۲۵۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلاً. أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ حَقّاً. (النساء۴: ۱۵۰۔۱۵۱)

''بے شک جولوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بعض رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ اس کے درمیان کوئی راستہ تلاش کرنا چاہتے ہیں، یہی لوگ پکے کافر ہیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو بھی یہودی اور عیسائی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لے کر آئے، وہ پکا کافر ہے، اور کافر مسلمانوں کی بنائی ہوئی عبادت گاہ کا کیسے وارث ہوسکتا ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی مسجد بنائی اور اس کی بعد میں آنے والی نسلوں میں سے کوئی یہودی ہوگیا تو کیا اب اس مسجد کو یہودیوں کی عبادت گاہ بنا کر اس یہودی کے کنٹرول میں دے دیا جائے گا؟ مسجد اقصیٰ پر اس وقت یہودیوں کا حق تھا جب تک وہ مسلمان تھے۔ آج بھی اگر وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتے ہیں تو ہمارا ان سے کوئی جھگڑا نہیں ہے، ہم مسجد اقصیٰ کی تولیت ان کے سپرد کر دیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنے نبی حضرت موسیٰ اور اپنے باپ حضرت ابراہیم کے دین سے بھی پھر جائیں تو کس بنیاد پر ان کو مسجد اقصیٰ کا وارث قرار دیا جائے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيّاً وَّلَا نَصْرَانِيّاً وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفاً مُّسْلِماً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ. (آل عمران۳: ۶۷۔۶۸)

''حضرت ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی، لیکن وہ ایک یکسو مسلمان تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ بے شک حضرت ابراہیم کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ولایت رکھنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس (کی قوم میں سے اس) کی پیروی کی اور یہ نبی ہیں اور وہ لوگ جو (اس نبی پر) ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا والی ہے۔''

حضرت ابراہیم کی طرح، حضرت موسیٰ اور حضرت سلیمان اور بنی اسرائیل کے تمام انبیا کے اصل ورثا اور جانشین مسلمان ہیں نہ کہ یہود و نصاریٰ۔ اگر حضرت سلیمان نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی بھی تھی تو اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ اب یہ مسجد کافروں کی عبادت گاہ بن گئی ہے؟ حضرت سلیمان کے دور میں موجود بنی اسرائیل مسلمان تھے، لہٰذا اس بنیاد پر اس مسجد کے وارث بھی تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض اور کینہ رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ پر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ایمان نہ لانے کی وجہ سے آج کل کے یہودیوں کے کافر ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، بلکہ ان کے کفر پر امت کا اجماع ہے، لہٰذا مسجد اقصیٰ جو کہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے، اس پر ایک کافر قوم کا حق کیسے جتایا جا سکتا ہے؟

بفرض محال اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ مسجد اقصیٰ پر یہود کا حق ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ اہل کتاب میں سے جو بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکاری ہو، وہ حضرت موسیٰ اور تورات کا بھی انکاری ہے، کیونکہ دونوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اور ان کی علامات کی خبر دی ہے۔ لہٰذا ایسا یہودی جو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ماننے کے ساتھ تورات اور حضرت موسیٰ کی بات بھی ماننے سے انکار کر دے، وہ تو اپنے دین، اپنے نبی اور اپنی کتاب کا بھی انکاری ہے اور ایسا یہودی مسجد اقصیٰ کا وارث کیسے ہو سکتا ہے؟

۲۔ تمام انبیا کا قبلہ بیت اللہ تھا:

تمام انبیا، بشمول انبیاے بنی اسرائیل، کا قبلہ بیت اللہ تھا۔ اس لیے یہودیوں کا قبلہ بھی، از روے دین اسلام، شروع سے ہی، بیت اللہ ہے۔ تمام انبیا بیت اللہ کی طرف ہی رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اور اسی کا حج کرتے تھے۔ یہودیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ''ہیکل سلیمانی'' ان کا قبلہ ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے کہ جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ایک ہی وقت میں دو متوازی قبلوں کا وجود خود مقصد قبلہ کے خلاف ہے۔ حضرت ابراہیم نے جب بیت اللہ کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حج کی آواز لگائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ. (الحج ۲۲:۲۷)	''اور (اے ابراہیم) لوگوں میں حج کا اعلان عام کر۔ وہ تیرے پاس آئیں گے، پیدل اور دبلے اونٹوں پر اور ہر دور کے راستے سے آئیں گے۔''

اگر یہ مان لیا جائے کہ بیت اللہ کے بالمقابل فلسطین میں حضرت سلیمان نے ایک علیحدہ قبلہ بنایا تو درج ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ کیا قرآن کی آیت میں موجود الفاظ 'الناس' میں بنو اسرائیل داخل نہیں ہیں؟

۲۔ اگر بنو اسرائیل کے آبا و اجداد حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب کا قبلہ بیت اللہ ہی تھا تو ان کی بعد میں آنے والی نسلوں کا قبلہ تبدیل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس کی کیا دلیل ہے کہ باپ (یعقوب) کا قبلہ بیت اللہ تھا اور بیٹوں (بنو اسرائیل) کا قبلہ بیت المقدس تھا؟ کیا بنو اسرائیل اپنے باپ حضرت یعقوب کے دین پر نہ تھے؟

۳۔ کیا تمام انبیا کا دین، دین اسلام نہیں ہے؟ کیا حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو یہ وصیت نہیں کی تھی:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

'ووصى بها ابراھيم بنيه ويعقوب يبنى ان الله اصطفى لكم الدين فلا تموتن الا وانتم مسلمون'؟ اگر تمام انبیا کا دین ایک ہی ہے، جیسا کہ قرآن وحدیث سے واضح ہوتا ہے تو پھر یہ کہنے کی کیا گنجایش رہ جاتی ہے کہ حضرت سلیمان سے پہلے انبیا کی نماز اور حج کے لیے قبلہ کی حیثیت بیت اللہ کو حاصل تھی، جبکہ حضرت سلیمان کے بعد نماز اور حج کے لیے بیت المقدس کو بنیادی حیثیت حاصل تھی؟

۴۔ تقریباً تمام مناسک حج مقامات کے ساتھ خاص ہیں، مثلاً طواف، صفا اور مروہ کی سعی، مقام ابراہیم پر نفل پڑھنا، منیٰ کا قیام، میدان عرفات اور مزدلفہ کا قیام وغیرہ۔ بیت المقدس کو اگر بنی اسرائیل کا قبلہ مان لیا جائے تو بیت المقدس کے حج کرنے کا کیا مطلب ہے۔ دوسرے الفاظ میں بنو اسرائیل کا حج کیا تھا؟

۵۔ بنو اسماعیل کا حج تو زمانۂ جاہلیت میں بھی کسی نہ کسی بگڑی ہوئی شکل میں موجود تھا، لیکن کیا یہودی بھی آپ کے زمانے میں بیت المقدس کا حج کرتے تھے یا آج کرتے ہیں؟ اگر نہیں، تو کیوں؟

۶۔ اگر بیت المقدس ہی قبلہ تھا تو یہود ونصاریٰ میں پھر قبلے کی تعیین میں اختلاف کیوں ہوا؟ یہود حق پر تھے یا نصاریٰ؟ اصل قبلہ قبۃ الصخرہ ہے یا بیت المقدس کا مشرقی حصہ؟

۷۔ اگر عمار صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہود کا قبلہ صحیح ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود یہود میں بھی تو اس قبلے کی تعیین میں اختلاف ہے کہ یہ صخرہ ہی ہے یا صخرہ کے قریب کوئی جگہ ہے۔ یہ کیسا قبلہ ہے کہ جس کے صحیح مقام کا آج تک تعین ہی نہ ہو سکا؟

۸۔ عمار صاحب کتاب مقدس کی کوئی ایک بھی واضح اور صریح نص پیش کر سکتے ہیں کہ جس میں یہ بیان ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو یہود کا قبلہ مقرر کیا تھا؟

۹۔ اگر عمار صاحب یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے 'وما أنت بتابع قبلتهم' میں اس بات کا اثبات کیا ہے کہ وہ یہود کا قبلہ ہے تو ہم یہ کہتے ہیں پھر 'ما ولھم عن قبلتهم التى كانوا عليها' میں کس کے لیے قبلے کا اثبات ہے؟

۱۰۔ اللہ تعالیٰ نے صرف یہود کے قبلے کا اثبات نہیں کیا، بلکہ نصاریٰ کے قبلے کا بھی اثبات کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: 'وما بعضهم بتابع قبلة بعض'، تو کیا کل تین قبلے ہیں؟

۱۱۔ حقیقت یہ ہے کہ قبلہ ایک ہی ہے جو کہ بیت اللہ ہے، باقی رہا قرآن کا مسجد اقصیٰ یا اس کے مشرقی حصہ کو قبلہ کہنا تو یہ اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کے اعتبار سے کہا ہے نہ کہ خود اپنی طرف سے ان کے لیے کسی علیحدہ قبلے کو مقرر کرنے کا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اثبات کیا ہے، جیسا کہ 'لکم دینکم ولی دین' میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے لیے علیحدہ دین کا اثبات تو کیا ہے، لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دین کو، ان کے لیے مقرر کیا ہے اور پسند بھی کیا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ عمار صاحب ہیکل سلیمانی کو یہود کا قبلہ قرار دینے پر مصر ہیں اور اس کے لیے انھوں نے دلیل حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس دعا کو بنایا ہے جو کہ بیت المقدس کے فیوض و برکات کے حوالے سے کتاب مقدس میں بیان ہوئی ہے۔ بیت المقدس کی برکات وفضائل سے کس کو انکار ہوسکتا ہے، لیکن کیا کسی مقام کی برکات وفضائل کا بیان اس کے قبلہ ہونے کی ایک کافی دلیل ہے؟ یہ کیسا قبلہ ہے کہ جس کے قبلہ ہونے کے بارے میں کوئی ایک بھی واضح نص قرآن وسنت تو کیا، کتاب مقدس میں بھی موجود نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیت المقدس کی حیثیت نہ تو حرم کی ہے اور نہ ہی یہ یہودیوں کا قبلہ رہا ہے۔ بیت المقدس کو اپنا قبلہ قرار دینا یہودیوں کی اختراع ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں کی آزمایش کے لیے ان کو وقتی طور پر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا جس کا تذکرہ بہت ساری روایات میں ملتا ہے۔ اس حکم خداوندی کی رو سے بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا جو حکم آپ پر نازل ہوا تھا، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ پہلی مسلمان امتوں کا قبلہ بیت المقدس تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ مسلمانوں کی آزمایش تھی، جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ. (البقرہ۲:۱۴۳)	''پہلے جس طرف تم رُخ کرتے تھے، اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسُول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹا پھر جاتا ہے۔''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس عارضی قبلے کو منسوخ قرار دے کر اصل قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم جاری فرمایا۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ. (البقرہ۲:۱۴۵)	''اور اے نبی، آپ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔''

قرآن مجید کی یہ نص اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ کی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی وجہ یہودیوں کی اتباع نہیں تھی، بلکہ آپ کو اللہ کی طرف سے یہ ایک حکم تھا۔ امام ابن کثیر اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وانـه لا يتبع أهوائهم فی جميع أحواله ولا كـونـه متوجها الی بيت المقدس لكونها قبلة اليهود وانما ذلك عن أمر الله.

''آپ کسی بھی معاملے میں یہودیوں کی اتباع نہیں کرتے تھے۔اسی طرح آپ کا بیت المقدس کی طرف رخ کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ یہود کا قبلہ ہے، بلکہ اس وجہ سے تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے آپ کو حکم تھا۔''

یہودیوں نے حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد قبۃ الصخرہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا آغاز کیا، جبکہ عیسائیوں میں قسطنطنین دی گریٹ (۲۷۲ءتا ۳۳۷ء) وہ پہلا عیسائی بادشاہ گزرا ہے جس نے بیت المقدس کی مشرقی جانب نماز پڑھنے کی بدعت کا آغاز کیا۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

قـالـوا وهـو الـذی ابتـد ع الصلوٰة الی الشـرق والا لـم يـصـل قـط احد من انبيــائهـم واتبــاعهـم الی الشرق ولم يشـرع الله مكانا يصلی اليه الا الكعبة والأنبيــاء الـخليل ومن قبله انما كانوا يـصـلـون الی الكعبة و موسیٰ لم يكن يـصلی الی البيت المقدس بل قالوا انه كـان يـنـصـب قبة الـعهـد الی العرب ويصلی اليها فی التيه. فلما فتح يوشع بيت المقدس بعد موت موسی نصب الـقبة الی الصخرة فكانوا يصلون اليها فـلـمـا خـرب بيـت المقدس وذهبت الــقبة صـارت اليهـود يـصـلـون الـی الـصـخـرة لأنه موضع القبة والسامرة يصلون الی جبل هناك قالوا لأنه كان عليه التابوت[20].

''ان کا کہنا ہے کہ مشرق کی طرف نماز پڑھنے کی بدعت کا آغاز قسطنطنین دی گریٹ نے کیا، جبکہ نصاریٰ کے انبیا اور ان کے متبعین میں سے کسی ایک نے بھی مشرق کی طرف رخ کر کے نماز نہیں پڑھی اور اللہ تعالیٰ نے کعبہ کے علاوہ کسی مقام کو بھی شریعت اسلامیہ میں نماز کے لیے جہت نہیں بنایا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ان سے ماقبل کے تمام انبیا کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور خود حضرت موسیٰ بھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز نہیں پڑھتے تھے، بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ خیمۂ عہد کو عرب کی طرف رخ کر کے نصب کرتے تھے اور صحرا میں اس خیمہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جب حضرت یوشع بن نون نے بیت المقدس کو فتح کر لیا تو خیمہ کو صخرہ پر نصب کیا۔ پس بنی اسرائیل خیمہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ جب بیت المقدس ویران ہوا اور خیمہ بھی چھن گیا تو یہود صخرہ کی طرف رخ کر کے نماز

[20] الرد علی المنطقیین، امام ابن تیمیہ ۲۸۹۔۲۹۰۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پڑھنے لگے، کیونکہ یہ خیمہ کی جگہ تھی اور سامرۃ (یہود سے علیحدہ ہونے والا ایک فرقہ) وہاں پر موجود ایک پہاڑ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے، کیونکہ تابوت سکینہ اس پر موجود تھا۔‘‘

امام ابن قیم لکھتے ہیں:

استقبال أهل الكتاب لقبلتهم لم يكن من جهة الوحی والتوقيف من اللّٰه بل كان عن مشورة منهم واجتهاد أما النصارٰی فلا ريب أن اللّٰه لم يأمرهم فی الانجيل ولا فی غيره باستقبال المشرق أبدا وهم مقرون بذالك ومقرون أن قبلة المسيح كانت قبلة بنی اسرائيل و هی الصخرة وانما وضع لهم شيوخهم واسلافهم هذه القبلة وهم يعتذرون عنهم بأن المسيح فوض اليهم التحليل والتحريم وشرع الأحكام وان ما حللوه وحرموه فقد حلله هو وحرمه فی السماء فهم مع اليهود متفقون علی أن اللّٰه لم يشرع استقبال المشرق علی لسان رسوله أبدا والمسلمون شاهدون عليهم بذالك و أما قبلة اليهود فليس فی التوراة الأمر باستقبال الصخرة البتتة و انما كانوا ينصبون التابوت ويصلون اليه من

’’اہل کتاب کا اپنے قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا یہ وحی سے یا اللہ کی طرف سے نہیں ہے، بلکہ انھوں نے اپنا قبلہ آپس کے مشورے اور اجتہاد سے مقرر کیا۔ جہاں تک نصاریٰ کا معاملہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انجیل یا اس کے علاوہ کسی کتاب میں ان کو کہیں بھی مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم کبھی نہیں دیا اور وہ اس بات کا خود بھی اقرار کرتے ہیں اور اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ حضرت مسیح کا قبلہ وہی ہے جو کہ بنو اسرائیل کا قبلہ ہے اور وہ صخرہ ہے اور ان کے شیوخ اور بڑوں نے مشرق کو قبلہ مقرر کیا اور وہ اپنے ان کبار شیوخ کی طرف سے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ حضرت مسیح نے ان کو تحلیل و تحریم اور تشریع احکام کا اختیار تفویض کیا تھا اور جس چیز کو انھوں نے حلال یا حرام قرار دیا، اس کو حضرت مسیح نے بھی آسمانوں پر سے حلال یا حرام قرار دے دیا۔ وہ یہود سے اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی رسول کی زبانی مشرق کو قبلہ نہیں بنایا اور مسلمان بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مشرق کو قبلہ نہیں بنایا۔ جہاں تک یہود کے قبلے کا تعلق ہے تو یہ بات

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حيث خرجوا فاذا نصبوه على الصخرة وصلوا اليه فلما رفع فصلوا الى موضعه وهو الصخرة وأماالسامرة فانهم يصلون الى طور لهم بأرض الشام يعظمونه ويحجون اليه ورأيته أنا وهو فى بلد نابلس وناظرت فضلائهم فى استقباله وقلت هو قبلة باطلة فقال مشار اليه فى دينهم هذه هى القبلة الصحيحة واليهود أخطأ وها لان اللّٰه تعالىٰ أمر فى التوراة باستقباله عينا ثم ذكر نصا يزعمه من التوراة فى استقبال فقلت هذا خطأ قطعا على التوراة لأنها انما أنزلت على بنى اسرائيل فهم المخاطبون بها وأنتم فرع عليهم فيها و انما تلقيتموها عنهم وهذا النص ليس فى التوراة التى بأيدينا وأنا رأيتها وليس هذا فيها فقال لى صدقت انما هو فى توراتنا خاصة.[21]

تو واضح ہے کہ تورات میں کہیں بھی صخرہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم نہیں بیان ہوا ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ وہ جہاں سے بھی نکلتے، تابوت کو نصب کرتے اور اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جب وہ بیت المقدس میں آئے تو انھوں نے اس تابوت کو صخرہ پر نصب کیا اور اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ پس جب تابوت کو اٹھا لیا گیا تو وہ صخرہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے، کیونکہ یہ تابوت کی جگہ تھی۔ جہاں تک سامرہ (یہودیوں سے علیحدہ ہونے والا ایک گروہ) کا تعلق ہے تو وہ ارض شام میں موجود ایک پہاڑ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ وہ اس کی تعظیم کرتے تھے اور اس کا قصد بھی کرتے تھے اور میں نے اس پہاڑ کو دیکھا ہے، وہ شہر 'نابلس' میں ہے اور میں (یعنی ابن قیم) نے جب اس فرقے کے علما سے بحث کی اور ان سے کہا کہ تمھارا قبلہ باطل اور بدعت ہے تو انھوں نے کہا کہ ان کے دین میں اس قبلہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہی صحیح قبلہ ہے اور یہودیوں نے قبلہ کے تعین میں خطا کھائی ہے، اللہ تعالیٰ نے تورات میں اسی پہاڑ کے استقبال کا حکم دیا ہے۔ پھر ان میں سے ایک نے اس پہاڑ کے استقبال کے بارے میں ایک نص پیش کی جس کے بارے میں اس کا گمان یہ تھا کہ یہ تورات کی آیت ہے تو میں نے کہا: یہ کہنا تورات کے بارے میں قطعی خطا ہے، کیونکہ تورات بنو اسرائیل پر نازل ہوئی اور وہ اس

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

[21] بدائع الفوائد، امام ابن قیم ۴/ ۱۷۱۔

کے اول مخاطبین ہیں اور تم ان کی ایک فرع ہو اور تم
نے تورات ان سے حاصل کی ہے اور یہ نص جو کہ تم پیش
کر رہے ہو، اس تورات میں نہیں ہے جو کہ بنو اسرائیل
کے پاس ہے اور میں نے اس تورات کو دیکھا ہے اور
اس میں یہ نص موجود نہیں ہے تو وہ (سامری عالم)
مجھے کہنے لگا: تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ نص ہماری خاص
تورات میں ہے۔''

۳۔ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی اس رائے کی تائید قرآنی نصوص، احادیث مبارکہ اور بعض تابعین و تبع تابعین کی آرا سے بھی ہوتی ہے۔

الف۔ اس رائے کی تائید میں چند ایک قرآنی دلائل درج ذیل ہیں:

بنی اسرائیل کی غلامی کے زمانے میں، جبکہ وہ ابھی تک قوم فرعون کے ظلم سے آزاد نہیں ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ حکم دیا تھا:

وَّاجۡعَلُوۡا بُيُوۡتَكُمۡ قِبۡلَةً وَّاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ. ''اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ بناؤ اور نماز قائم کرو۔''

(یونس ۱۰: ۸۷)

یہاں بنی اسرائیل کو کس قبلے کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے؟ کیا بیت المقدس کی طرف کہ جس کی بنیاد بقول عمار صاحب سینکڑوں سال بعد حضرت سلیمان کے دور میں رکھی جانی تھی؟ یہ آیت مبارکہ اس مسئلے میں نص قطعی کا درجہ رکھتی ہے کہ بنی اسرائیل کو بھی اپنی نمازوں میں جس قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ بیت اللہ ہی ہے، کیونکہ اس آیت میں قبلہ کا لفظ مطلقاً استعمال کیا گیا ہے یعنی مراد وہ قبلہ ہے جو کہ اس وقت اور اس سے ماقبل کی اقوام میں بطور قبلہ معروف تھا اور وہ سب کے نزدیک بیت اللہ ہی ہے۔ امام طبری اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں صحابہ و تابعین کے اقوال نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عن مجاهد قال قال ابن عباس فی
قوله تعالٰی واجعلوا بیوتکم قبلة یقول
وجهوا بیوتکم مساجدکم نحو القبلة
ألا ترى أنه يقول في بيوت أذن الله أن

''حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ابن عباس نے
'واجعلوا بیوتکم قبلة' کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ
اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اپنے گھروں یعنی مساجد کو قبلہ
رخ بناؤ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ترفع.

’فی بیوت أذن اللّٰه أن ترفع‘(اس آیت مبارکہ میں مساجد کے لیے ’بیوت‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے)۔‘‘

عن سعید ابن جبیر عن ابن عباس واجعلوا بیوتکم قبلة یعنی الکعبة.

’’حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے، وہ حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ’واجعلوا بیوتکم قبلة‘ کی تفسیر میں فرمایا کہ قبلہ سے مراد ’’کعبہ‘‘ ہے۔‘‘

عن مجاهد بیوتکم قبلة قال نحو الکعبة حین خاف موسیٰ ومن معه من فرعون أن یصلوا فی الکنائس الجامعة فأمروا أن یجعلوا فی بیوتهم مستقبلة الکعبة یصلون فیها سرا.

’’حضرت مجاہد سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ’واجعلوا بیوتکم‘ سے مراد ہے کہ اپنے گھروں کو کعبہ کے رخ بناؤ۔ جب موسیٰ اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں نے اپنی عبادت گاہوں میں اکٹھے ہو کر نماز پڑھنے میں فرعون سے خوف محسوس کیا تو انھیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھروں کو کعبہ کے رخ بنالیں اور ان میں چھپ کے نماز پڑھیں۔‘‘

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَ هُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَ كَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذاً لَّمِنَ الظَّالِمِيْنَ .

(البقرہ ۲: ۱۴۵)

’’اور اگر آپ ان اہل کتاب کے پاس ہر قسم کی نشانی ہی کیوں نہ لے آئیں، وہ آپ کے قبلے کی پیروی ہرگز نہ کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں اور ان میں بعض، ان کے بعض کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آ گیا تو تب آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔‘‘

اس آیت مبارکہ کے انداز خطاب سے معلوم ہو رہا ہے کہ اہل کتاب سے بھی اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ بیت اللہ کو اپنا قبلہ بنائیں جو کہ تمام انبیا کا قبلہ رہا ہے، لیکن اہل کتاب کی ضد اور اسلام دشمنی کے بارے میں خبر دیتے ہوئے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ ان اہل کتاب کے پاس ہر قسم کی نشانی لے آئیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ بیت اللہ ہی اصل قبلہ ہے، اہل کتاب کا بھی اور مسلمانوں کا بھی، تو پھر بھی یہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔

'وما أنت بتابع قبلتهم' میں 'قبلتهم' سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو ان کا قبلہ بنایا ہے۔ اس کی دلیل آیت کا یہ اگلا ٹکڑا ہے: 'وما بعضهم بتابع قبلة بعض' کیونکہ اس بات پر تو اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین قبلے نہیں بنائے، جبکہ آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے تین قبلوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک مسلمانوں کا قبلہ جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قبلہ مقرر کیا ہے، جیسا کہ اسی آیت مبارکہ کے سیاق وسباق سے واضح ہوتا ہے۔ دوسرا عیسائیوں اور تیسرا یہودیوں کا قبلہ ہے جنھوں نے اپنی خواہش اور آزاد مرضی سے بیت المقدس کی مشرقی جانب اور قبۃ الصخرہ کو قبلہ بنا لیا تھا۔ امام ابن جریر طبری اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

وما لك يا محمد سبيل اتباع قبلتهم وذلك أن اليهود تستقبل بيت المقدس لصلاتها وأن النصارى تستقبل المشرق فأنى يكون لك السبيل الى اتباع قبلتهم مع اختلاف وجوهها.

''اے محمد، آپ کے لیے ان کے قبلے کی پیروی کرنا جائز نہیں ہے اور یہ اس وجہ سے کہ یہود اپنی نماز میں بیت المقدس کی طرف، جبکہ نصاریٰ اس کے مشرقی حصے کی طرف رخ کرتے ہیں۔ اے نبی، آپ کیسے ان کے قبلے کی پیروی کریں گے، جبکہ خود ان میں آپس میں قبلے کے تعین میں اختلاف ہے۔''

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ. (البقرہ۲: ۱۴۶)

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی (یعنی اہل کتاب) وہ اس (یعنی بیت اللہ کے قبلہ ہونے) کو اس طرح پہچانتے ہیں، جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔''

امام ابن جریر طبری اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يعرف هؤلاء الأحبار من اليهود والعلماء من النصارى أن البيت الحرام قبلتهم و قبلة ابراهيم وقبلة الأنبياء قبلك كما يعرفون أبنائهم.

''یہود ونصاریٰ کے علما یہ جانتے ہیں کہ مسجد حرام ان کا قبلہ ہے اور یہی حضرت ابراہیم اور آپ سے پہلے تمام انبیا کا قبلہ تھا، جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس آیت مبارکہ میں بعض مفسرین نے 'یعرفونہ' کی 'ہ' ضمیر کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا ہے، لیکن 'ہ' ضمیر کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹانا قرآن کے سیاق وسباق کے خلاف ہے۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِنَّ فَرِيْقاً مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۴۶)

''اور ان میں سے ایک گروہ حق بات (یعنی بیت اللہ ہی کے اصل قبلہ ہونے) کو جانتے بوجھتے چھپا رہا ہے۔''

امام ابن جریر طبری 'وان فریقا منهم لیکتمون الحق وهم یعلمون' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وذلك الحق هو القبلة التی وجه اللّٰه عزوجل الیها نبیه محمدا صلی اللّٰه علیه وسلم یقول فول وجهك شطر المسجد الحرام التی كانت الأنبیاء من قبل محمد یتوجهون الیها فكتمها الیهود والنصاریٰ فتوجه بعضهم شرقا وبعضهم نحو بیت المقدس ورفضوا ما أمرهم اللّٰه به.

'''الحق' سے مراد قبلہ ہے جس کی طرف رخ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ مسجد حرام کی طرف اپنا رخ پھیر لیں جس کی طرف آپ سے پہلے تمام انبیا رخ کرتے تھے۔ پس یہود و نصاریٰ نے اصل قبلے (یعنی بیت اللہ) کو چھپا لیا اور کسی نے مشرق کی طرف رخ کیا اور کسی نے بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنایا اور انھوں نے اس کا انکار کیا جس کا اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا۔''

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَاتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ. (البقرہ ۲: ۱۴۷)

''یہ (یعنی بیت اللہ کا قبلہ ہونا) حق ہے آپ کے رب کی طرف سے، پس آپ (بیت اللہ کے ہی قبلہ ہونے میں) شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں۔''

امام ابن جریر طبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

أی فلا تكونن من الشاكین فی أن القبلة التی وجهتك نحوها قبلة ابراهیم خلیلی علیه السلام وقبلة

''اے نبی، آپ اس بارے میں بالکل بھی شک میں مبتلا نہ ہوں کہ جس قبلہ کی طرف ہم نے آپ کا رخ کیا ہے، وہی حضرت ابراہیم اور ان کے علاوہ تمام انبیا

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

الأنبياء غيره.

کا قبلہ ہے۔''

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ. (البقرہ۲:۱۴۸)

''اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے، وہ اس کی طرف اپنے آپ کو پھیرنے والا ہے۔ پس تم (اے مسلمانو)، نیکیوں میں سبقت لے جاؤ۔''

امام طبری اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

أی قد بينت لكم أيها المؤمنون الحق وهديتكم القبلة التی ضلت عنها اليهود والنصارٰی وسائر الملل غيركم فبادروا بالأعمال الصالحة شكرا لربكم.

''اے اہل ایمان، میں نے تمھارے لیے حق بات کو واضح کر دیا تھا اور اس قبلے کی طرف تمھاری رہنمائی کی ہے جس سے یہود و نصاریٰ اور تمھارے علاوہ تمام مذاہب بھٹک گئے تھے، پس تم اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے نیکی کے کاموں میں جلدی کرو۔''

ب۔ بعض ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ بیت المقدس یہود کا قبلہ نہیں ہے، بلکہ ان کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی تھا۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں:

كنا عند ابن عباس فذكروا الدجال أنه قال مكتوب بين عينيه كافر فقال ابن عباس لم أسمعه ولكنه قال أما موسٰى كأنی أنظر اليه اذا انحدر فی الوادی يلبی[۲۲].

''ہم ابن عباس کے پاس تھے کہ لوگوں نے دجال کا تذکرہ کیا کہ آپ نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوگا تو ابن عباس نے کہا: میں نے یہ بات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی، بلکہ میں نے آپ سے سنا ہے، آپ کہہ رہے تھے کہ جہاں تک حضرت موسیٰ کا معاملہ ہے تو گویا کہ میں ان کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ وادی میں تلبیہ کہتے ہوئے اتر رہے ہیں۔''

یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انبیاے بنی اسرائیل بھی حج کرنے کے لیے بیت اللہ کا ہی قصد کرتے تھے۔ علامہ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

۲۲؎ صحیح بخاری: کتاب الحج، باب: التلبية اذا انحدر فی الوادی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

و فی الحدیث أن التلبیة فی بطون الأودیة من سنن المرسلین.

''اور اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ وادیوں کے درمیان میں تلبیہ کہنا رسولوں کی سنت ہے۔''

ایک دوسری روایت میں حضرت یونس بن متی کا بھی تذکرہ ہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے:

عن ابن عباس أن رسول اللّٰہ مر بوادی الأزرق فقال أی واد ھذا قالوا ھذا وادی الأزرق فقال کأنی أنظر الی موسٰی وھو ھابط من الثنیة وله جؤار الی اللّٰہ عزوجل بالتلبیة حتی أتی علی ثنیة ھرشاء فقال أی ثنیة ھذا قالوا ثنیة ھرشاء قال کأنی أنظر الی یونس بن متی علی ناقة حمراء جعدة علیه جبة من صوف خطام ناقته خلبة قال ھشیم یعنی لیف وھو یلبی۔[۲۳]

''حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر وادی ازرق سے ہوا تو آپ نے سوال کیا کہ یہ کون سی وادی ہے؟ صحابہ نے کہا: یہ وادی ازرق ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: گویا کہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گھاٹی سے اترتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور وہ بلند آواز سے تلبیہ کہہ رہے ہیں۔ پھر آپ ہرشاء کی گھاٹی پر آئے اور آپ نے پوچھا: یہ کون سی گھاٹی ہے؟ صحابہ نے کہا: یہ ہرشاء کی گھاٹی ہے تو آپ نے فرمایا: گویا کہ میں یونس بن متی کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک سرخ موٹی تازی مضبوط گوشت والی اونٹنی پر سوار ہیں اور انھوں نے اون کا ایک جبہ پہن رکھا ہے، ان کی اونٹنی کی لگام کھجور کے درخت کی چھال کی ہے اور وہ تلبیہ کہہ رہے ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیا بیت اللہ کا حج کرتے تھے۔ عمار صاحب بنو اسرائیل کے کسی ایک نبی کے بارے میں یہ ثابت کر دیں کہ اس نے بیت المقدس کا حج کیا ہو۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ، جن پر تورات نازل ہوئی، ان کا قبلہ بیت اللہ تھا۔ اگر عمار صاحب یہ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان کے دور میں بنو اسرائیل کا قبلہ تبدیل ہو گیا تھا تو اس کی کیا دلیل ہے کہ پہلے ان کا قبلہ بھی وہی تھا جو کہ تمام انبیا کا تھا، پھر حضرت سلیمان کے دور میں ان کا قبلہ بیت المقدس قرار پایا؟ امر واقعہ یہ ہے

۲۳؎ صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب: الاسراء برسول اللّٰہ الی السمٰوات. و رواہ الامام احمد فی مسندہ و اللفظ له۔

کہ یہود نے اپنے اصل قبلہ، جو کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ سے چلا آ رہا تھا، سے انحراف کرتے ہوئے اپنے مشورے اور اجتہاد سے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کر لیا تھا، جیسا کہ امام طبری، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔

اسی طرح بعض صحیح احادیث میں بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی فضیلت ایک عام مسجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ بیان کی گئی ہے۔ اگر بیت المقدس یہودیوں کا قبلہ اور عبادت گاہ ہے تو وہاں نماز پڑھنے کی کیا تک بنتی ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری طرز عمل یہ تھا کہ آپ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی یہودیوں کی مخالفت کرتے تھے، چہ جائیکہ آپ مسلمانوں کو ان کے قبلے اور عبادت گاہ میں جا کر نماز پڑھنے کی ترغیب دلائیں۔

ج۔ بعض تابعین اور تبع تابعین کی آرا سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرون ثلاثہ میں یہ رائے بہت عام تھی کہ تمام انبیا کا قبلہ بیت اللہ ہی رہا ہے اور بیت المقدس کو قبلہ قرار دینا یہودیوں کی ایک اختراع تھی اور یہودیوں کی اسی اختراع کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے آزمایش بناتے ہوئے بیت المقدس کو کچھ عرصہ کے لیے ان کا عارضی قبلہ قرار دیا۔ ان میں سے چند ایک اقوال یہ ہیں:

عن السدی: 'یعرفونه کما یعرفون أبنائهم' یعرفون الکعبة أنها هی قبلة الأنبیاء کما یعرفون أبنائهم وروی عن قتادة والربیع بن أنس والضحاك نحو ذلك.

''حضرت سدی سے روایت ہے کہ 'یعرفونه کما یعرفون ابنائهم' سے مراد یہ ہے کہ وہ یہ بات کہ کعبہ ہی تمام انبیا کا قبلہ ہے، اس طرح جانتے ہیں جس طرح کہ وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔ قتادہ، ضحاک اور ربیع بن انس سے بھی اسی قسم کا مفہوم مروی ہے۔''

عن الربیع قوله تعالٰی: 'الذین آتیناهم الکتٰب یعرفونه کما یعرفون أبنائهم' عرفوا قبلة البیت الحرام هی قبلتهم التی أمروا بها کما عرفوا أبنائهم.

''حضرت ربیع سے روایت ہے کہ آیت مبارکہ 'الذین آتیناهم الکتٰب یعرفونه کما یعرفون أبنائهم' سے مراد ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ مسجد حرام ہی وہ قبلہ ہے جس کے استقبال کا ان کو حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔''

عن الربیع 'الحق من ربك فلا تکونن من الممترین' یقول فلا تکونن فی شك من ذلك فانها قبلتك وقبلة

''حضرت ربیع سے مروی ہے، وہ 'الحق من ربك فلا تکونن من الممترین' کے بارے میں کہتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ اے محمد، آپ اس بارے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

الأنبياء قبلك.

میں کسی قسم کے شک وشبہ میں مبتلا نہ ہوں کہ کعبہ ہی آپ کا بھی اور آپ سے پہلے انبیا کا بھی قبلہ تھا۔''

عن أبی العالیة قال: قال اللّٰه لنبیه: 'الحق من ربك فلا تكونن من الممترین' فیقول لا تكونن فی شك یامحمد ان الكعبة هی قبلتك وكانت قبلة الأنبیاء قبلك.

''حضرت ابوالعالیہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے کہا ہے: 'الحق من ربك فلا تكونن من الممترین'، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد، آپ اس بارے میں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہ ہوں کہ کعبہ ہی آپ کا بھی قبلہ ہے اور آپ سے پہلے تمام انبیا کا بھی قبلہ تھا۔''

عن أبی العالیة 'ولكل وجهة هو مولیها' قال للیهود وجهة هو مولیها وللنصرانی وجهة هو مولیها وهداكم اللّٰه أنتم ایتها الأمة القبلة التی هی القبلة وروی عن مجاهد أحد قولیه والضحاك وعطاء والسدی والربیع نحو ذلك.

''حضرت ابوالعالیہ 'ولكل وجهة هو مولیها' کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہود کے لیے ایک جہت ہے جس کی طرف وہ رخ کرتے ہیں، اسی طرح عیسائیوں کے لیے ایک جہت ہے جس کی طرف وہ رخ کرتے ہیں، اور اے امت مسلمہ، اللہ تعالیٰ نے تمھاری اس قبلے کی طرف رہنمائی کی ہے جو کہ اصل قبلہ ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں امام مجاہد کے دو اقوال میں سے ایک قول یہی ہے۔ اس کے علاوہ ضحاک، عطا، سدی اور ربیع سے بھی اس قسم کا قول نقل کیا گیا ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

د۔ دلیل استصحاب سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہود کا اصل قبلہ بیت اللہ ہی ہے۔ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی استصحاب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وعند الأصولیین هو الحكم بثبوت أمر أو نفیه فی الزمان الحاضر أو المستقبل، بناءً علی ثبوته أو عدمه فی الزمان الماضی، لعدم قیام الدلیل علی تغییره.[۲۴]

''اصولیین کے نزدیک، زمانۂ حال یا مستقبل میں، کسی حکم کے ثبوت یا عدم ثبوت کی بنیاد، ماضی میں اس حکم کے ثبوت یا عدم ثبوت پر رکھنا، جبکہ اس حکم کے تبدیل ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو، استصحاب کہلاتا ہے۔''

۲۴؎ اصول الفقہ الاسلامی، الدکتور وہبہ الزحیلی ۱/۸۵۹۔

قرآنی نصوص، احادیث صحیحہ اور اجماع امت سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد بنو اسرائیل اور بنو اسماعیل کا قبلہ بیت اللہ تھا۔ اب اگر کوئی شخص اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں بیت اللہ کو منسوخ کر کے، بیت المقدس کو بنو اسرائیل کا قبلہ مقرر کیا گیا تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس بات کی دلیل پیش کرے کہ بیت اللہ کو بنو اسرائیل کے لیے بطور قبلہ منسوخ کر دیا گیا ہے۔ کیا اسرائیلیات (کتاب مقدس) میں اس نسخ کی کوئی دلیل ہے؟

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بیت المقدس مسلمانوں کا تو عارضی طور پر قبلہ مقرر کیا گیا، لیکن یہ یہود کا قبلہ کبھی بھی نہیں رہا۔ قرآن و حدیث تو کیا، اسرائیلیات (کتاب مقدس) میں بھی کوئی ایک بھی ایسی نص نہیں ہے کہ جس سے یہ واضح ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے لیے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا تھا، بلکہ قرآنی آیات، بہت ساری روایات، تاریخی حقائق اور ائمۂ سلف کی آرا اس موقف کی تائید کرتی نظر آتی ہیں کہ یہود کا قبلہ بیت اللہ ہی تھا۔ جب یہ ثابت ہوا کہ بیت المقدس نہ تو یہود کی عبادت گاہ ہے اور نہ ہی یہ ان کا قبلہ ہے تو یہ دعویٰ بھی باطل ہے کہ بیت المقدس پر یہودیوں کا حق ہے، بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ بیت المقدس 'و ما جعلنا القبلة التی کنت علیها' کے مطابق مسلمانوں کی عبادت گاہ اور سابقہ قبلہ ہے، اس لیے وہی اس کی تولیت کا بھی شرعی حق رکھتے ہیں۔

دوسروں کے موقف میں شکوک و شبہات پیدا کرنا اور اپنے موقف کے اثبات کے لیے ایک دلیل بھی پیش نہ کر سکنا، اگر اہل فن کے ہاں تحقیق اسی کو کہتے ہیں تو واقعتاً عمار صاحب کا مضمون ایک تحقیقی مقالہ ہے، کیونکہ عمار صاحب نے اپنے پورے مضمون میں یہی کام کیا ہے۔ میں نے عمار صاحب کے مضمون کا کئی دفعہ بغور مطالعہ کیا، لیکن اس طویل مضمون میں مجھے سوائے حضرت سلیمان کی دعا کے کوئی اور عبارت ایسی نظر نہیں آئی کہ جسے عمار صاحب نے بیت المقدس کو یہود کا قبلہ ثابت کرنے کے لیے پیش کیا ہو۔ عمار صاحب سے گزارش ہے کہ انھوں نے علما کے موقف کا رد تو بہت اچھا کر دیا ہے، اب ذرا اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے بھی کوئی دلیل پیش کریں۔ دوسروں کے موقف کا رد کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کا موقف ثابت ہو گیا ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد عمار خان ناصر

مسجد اقصیٰ کی بحث اور حافظ محمد زبیر کے اعتراضات

www.javedahmadghamidi.com

مسجد اقصیٰ کی تولیت کی شرعی حیثیت کے حوالے سے ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۴ء میں ''الشریعہ'' اور ''اشراق'' کے صفحات میں جو بحث چلتی رہی ہے، برادرم حافظ محمد زبیر صاحب نے کم وبیش تین سال کے وقفے کے بعد اس کو دوبارہ چھیڑا ہے اور بحث وتنقید کے بعض نئے پہلوا جاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسجد اقصیٰ سے بنی اسرائیل کے حق تولیت کی نفی اور امت مسلمہ کے حق تولیت کے اثبات کے حوالے سے مختلف اطراف سے جو شرعی، قانونی یا تاریخی استدلالات سامنے آئے تھے، ہم نے ''اشراق'' کے مئی/جولائی ۲۰۰۴ اور ''الشریعہ'' کے اپریل/مئی ۲۰۰۴ کے شمارے میں ان کا مفصل تنقیدی جائزہ لیا تھا، تاہم فاضل ناقد کی رائے میں کسی بھی ناقد نے ہماری ''اصولی غلطی'' کی نشان دہی نہیں کی۔ ان کی رائے میں اس بحث کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ آیا مسجد اقصیٰ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کا قبلہ مقرر کیا گیا تھا یا نہیں۔ فاضل ناقد نے اس نکتے کو ہمارے استدلال کا بنیادی ستون قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ ہم نے مخالف نقطۂ نظر کے استدلالات کا ''ردتو بہت اچھا کر دیا ہے'' لیکن خود اپنے موقف کے حق میں مثبت طور پر ایک بھی دلیل پیش نہیں کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایسے دلائل وشواہد جمع کیے ہیں جن سے ان کے خیال میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کو بنی اسرائیل کا قبلہ مقرر کیے جانے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کو یہ حیثیت انھوں نے از خود اپنے اجتہاد سے دے دی تھی۔

ہمیں افسوس ہے کہ فاضل ناقد سرے سے ہمارے موقف اور استدلال ہی کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ہم نے اپنی تحریر میں مسجد اقصیٰ کے بنی اسرائیل کی عبادت گاہ اور قربان گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا

قبلہ ہونے کا بھی ذکر کیا ہے اور اسی بات کے درست ہونے پر اطمینان رکھتے ہیں، تاہم واقعہ یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تولیت کا حق دار بنی اسرائیل کو قرار دینے میں اس کا ''قبلہ'' ہونا محض ایک اضافی بات کی حیثیت رکھتا ہے، اس پر ہمارے موقف کی بنیاد یا اس کے حق میں ہمارے استدلال کا انحصار ہرگز نہیں ہے۔ یہ بات اگر فرضاً درست تسلیم کر لی جائے کہ یہ مسجد ان کا ''قبلہ'' نہیں تھی تو بھی ہمارے موقف یا استدلال میں سرمو کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس مسجد کو بنی اسرائیل کی عبادت گاہ، قربانی اور دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کے لیے مقدس مقام اور روحانی مرجع و مرکز مقرر کیے جانے سے، جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں، فاضل ناقد کو بھی اختلاف نہیں، اور اسی پر ہمارے استدلال کی بنیاد ہے۔ فاضل ناقد ہمارے استدلال کا بنیادی مقدمہ اپنے ذہن سے طے کر کے اس کی دلیل ہماری تحریروں میں ڈھونڈتے رہے اور ان کے بقول اس کے لیے انھیں ان تحریروں کو ''کئی دفعہ بغور'' پڑھنے ـــــ اور صرف پڑھنے ـــــ کی زحمت اٹھانا پڑی۔ اگر وہ تھوڑی سی معروضیت سے کام لینا گوارا کرتے تو انھیں ہمارا مقدمۂ استدلال بحث کے آغاز ہی میں بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں لکھا ہوا مل جاتا۔ ہم نے لکھا ہے:

''قرآن وسنت کی رو سے کسی مذہب کے ماننے والوں کو ان کی کسی عبادت گاہ، بالخصوص قبلہ اور مرکز عبادت کے حق تولیت سے محروم کرنا ایک ایسا نازک معاملہ ہے جو شارع کی جانب سے ایک واضح نص کا متقاضی ہے۔ اس کے بغیر اس معاملے میں محض عقلی استدلال کی بنیاد پر کوئی اقدام کیا ہی نہیں جا سکتا۔''

(الشریعہ، ستمبر/ اکتوبر ۲۰۰۳، ۴۱)

اس اقتباس میں ''کسی عبادت گاہ، بالخصوص قبلہ اور مرکز عبادت'' کے الفاظ سے واضح ہے کہ حق تولیت کے حوالے سے ہمارے موقف کی بنیاد کسی مخصوص مقام کے کسی خاص مذہبی گروہ کی ''عبادت گاہ'' ہونے پر ہے، جبکہ اس کا 'قبلہ' ہونا اضافی طور پر اس کو ایک خصوصی حیثیت دے دیتا ہے۔ اب جہاں تک کسی 'عبادت گاہ' کے حق تولیت کا تعلق ہے تو فاضل ناقد نے اس ضمن میں بحث کو سرمو آگے نہیں بڑھایا، بلکہ ان کی سوئی بھی سابقہ ناقدین کی طرح ایک ہی نکتے پر اٹکی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''حضرت ابراہیم کی طرح حضرت موسیٰ اور حضرت سلیمان اور بنی اسرائیل کے تمام انبیا کے اصل ورثا اور جانشین مسلمان ہیں نہ کہ یہود و نصاریٰ۔ اگر حضرت سلیمان نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی بھی تھی تو اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ اب یہ مسجد کافروں کی عبادت گاہ بن گئی ہے۔ حضرت سلیمان کے دور میں موجود بنی اسرائیل مسلمان تھے، لہٰذا اس بنیاد پر اس مسجد کے وارث بھی تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض اور کینہ رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے آج کل کے یہودیوں کے کافر ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، بلکہ ان کے کفر پر امت کا اجماع ہے، لہٰذا مسجد اقصیٰ جو کہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے، اس پر ایک کافر قوم کا حق کیسے جتایا جا سکتا ہے؟''

واقعہ یہ ہے کہ اس پورے استدلال پر ہم اپنی تحریر میں تفصیلی تنقید کر کے اپنی بساط کی حد تک اس کی خامی کو مختلف پہلوؤں سے واضح کر چکے ہیں۔ یہ تنقید ''اشراق'' کے مئی/ جولائی ۲۰۰۴ اور ''الشریعہ'' کے اپریل/ مئی ۲۰۰۴ کے شماروں کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ فاضل ناقد نے اپنے مضمون میں از راہ عنایت یہ تسلیم فرمایا ہے کہ ہم نے ''علما کے موقف کا رد بہت اچھا کر دیا ہے''۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ اگر ان کے پیش کردہ اس استدلال کا بھی ہم ''بہت اچھا رد'' کر چکے ہیں تو انھوں نے اسے دوبارہ کیوں پیش فرما دیا؟ اور اگر ہم اس استدلال کا ''بہت اچھا رد'' نہیں کر سکے تو پھر انھوں نے ہمارے اٹھائے ہوئے تنقیدی نکات سے تعرض کیوں نہیں کیا اور تنقید کے نقص یا کمزوری کو واضح کرنے کے بجائے محض استدلال کو دہرا دینے پر اکتفا کیوں کی ہے؟

اس تناظر میں ہم مسجد اقصیٰ کے زمانۂ تعمیر اور اس کے قبلہ مقرر کیے جانے یا نہ کیے جانے کے حوالے سے فاضل ناقد کی اٹھائی ہوئی بحثوں سے اختلاف کا حق محفوظ رکھتے ہوئے سر دست ان سے کوئی تعرض نہیں کر رہے۔ فاضل ناقد اگر اصل نکتۂ اختلاف کے تصفیے کے بعد ان ضمنی نکات پر بحث کو آگے بڑھانا چاہیں گے تو ہم ان کے حوالے سے بھی اپنی گزارشات تفصیل کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ البتہ ہم سمجھتے ہیں کہ حالیہ ''تاریخی و تحقیقی جائزے'' میں فہم و استنباط اور تحقیق و تنقید کے جو نادر نمونے پیش کیے گئے ہیں، ان کو داد سے بالکل محروم رکھنا یقیناً ناانصافی ہوگی۔ چنانچہ چند معروضات محض اس احساس کے تحت پیش کی جا رہی ہیں کہ فاضل ناقد ہمارے گریز کو خدانخواستہ اپنی محنت اور کاوش کی ناقدری پر محمول نہ کر لیں۔

۱۔ صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کی تاسیس کے مابین زمانی فاصلے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مسجد اقصیٰ، مسجد حرام کے چالیس سال بعد بنائی گئی تھی۔

فاضل ناقد نے اس روایت کو مسجد اقصیٰ کا زمانۂ تعمیر متعین کرنے میں بنیادی ماخذ قرار دیا ہے اور اس ضمن میں تین آرا نقل کی ہیں:

الف۔ اگر مسجد حرام کا بانی حضرت ابراہیم کو تسلیم کر لیا جائے تو مسجد اقصیٰ کے بانی بھی حضرت ابراہیم قرار پائیں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

گے۔

ب۔ اگر مسجد حرام کا پہلا معمار حضرت آدم کو مانا جائے تو مسجد اقصیٰ کے موسس بھی وہی قرار پائیں گے۔ فاضل ناقد نے قرائن وشواہد کی روشنی میں اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

ج۔ مسجد حرام کے بانی تو حضرت ابراہیم ہیں، جبکہ مسجد اقصیٰ کی تاسیس حضرت یعقوب نے کی۔

ہم نے اپنی تحریر میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ روایت سے پیدا ہونے والے ایک تاریخی اشکال کے تناظر میں اس تیسری رائے کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا:

''اس روایت پر یہ اشکال ہے کہ تاریخ کے مسلمات کی رو سے مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی اور ان کے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے مابین، جو مسجد حرام کے معمار تھے، کئی صدیوں کا فاصلہ ہے، جبکہ روایت میں دونوں مسجدوں کی تعمیر کے درمیان صرف چالیس سال کا فاصلہ بتایا گیا ہے۔ علماے حدیث کے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کے مقام کی تعیین تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرما دی تھی اور مذکورہ روایت میں اسی کا ذکر ہے، جبکہ حضرت سلیمان نے صدیوں بعد اسی جگہ پر ہیکل سلیمانی کو تعمیر کیا۔ اس لحاظ سے ان کی حیثیت ہیکل کے اولین بانی اور موسس کی نہیں، بلکہ تجدید کنندہ کی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اب فاضل ناقد نے مذکورہ تین آرا میں سے پہلی دونوں کو تو ''دلائل کی روشنی میں قوی'' قرار دیا ہے، لیکن آخری رائے کی درستی کا امکان تک تسلیم کرنے سے اس قدر نفور کا اظہار کیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ 'علماے حدیث' میں سے کسی ایک کو بھی اس کا قائل تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے، بلکہ اس کی بے وقعتی واضح کرنے کے لیے اس کو اختیار کرنے والے دو جید صاحبان علم، ابن قیم اور ابن کثیر رحمہما اللہ کو بھی 'علماے حدیث' کی صف سے نکال باہر کیا ہے۔ اس دوسری بات کے حق میں انھوں نے جو استدلال فرمایا ہے، اس سے تو اہل علم کسی تبصرے کی آمیزش کے بغیر براہ راست زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں، البتہ پہلی بات کے بارے میں ہم، محض اپنی کوتاہی فہم کی وجہ سے، فاضل ناقد سے یہ استفسار کرنا چاہیں گے کہ از راہ کرم اس بنیادی فرق کی وضاحت فرما دیجیے جو پہلی توجیہ کو تو ''دلائل کی روشنی میں قوی'' بنا دیتا ہے، جبکہ تیسری توجیہ کو سرے سے قابل التفات ہی نہیں رہنے دیتا۔ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ جب مسجد حرام کا بانی حضرت ابراہیم کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے چالیس سال بعد بننے والی مسجد اقصیٰ کے موسس کے طور پر حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام، تینوں کے نام امکان کے درجے میں بالکل یکساں قرار پاتے ہیں اور جب تک کوئی یقینی قرینہ ان میں سے کسی ایک کو متعین کرنے کے حق میں نہ پایا جائے، قیاس اور تخمین کی حد تک

تینوں میں سے کسی بھی صورت کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت ابراہیم کے اس مسجد کا بانی ہونے کے حق میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہ بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل، دونوں کے جد امجد تھے، اس لیے انھوں نے ان دونوں مقدس مقامات عبادت کی تاسیس خود ہی فرما دی ہوگی۔ دوسری طرف حضرت اسحاق یا حضرت یعقوب کے بانی ہونے کے حق میں یہ قرینہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ مسجد اقصیٰ چونکہ خاص طور پر بنی اسرائیل ہی کی ایک قومی عبادت گاہ تھی، اس لیے اس کی تاسیس بھی آل ابراہیم کی اسی شاخ کے کسی بزرگ یعنی حضرت اسحاق یا حضرت یعقوب نے فرمائی ہوگی۔ ابن قیم اور ابن کثیر نے مذکورہ امکانات میں سے دوسرے امکان کو ترجیح دی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ جیسے پہلے قیاس کے حق میں کوئی نص موجود نہیں، اسی طرح ابن قیم اور ابن کثیر بھی اپنے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں رکھتے۔ فاضل ناقد سے ہمارا سوال یہ ہے کہ مسجد حرام کا بانی حضرت ابراہیم کو قرار دینے کی رائے کو ''دلائل کی روشنی میں قوی'' تسلیم کرنے کے بعد مسجد اقصیٰ کے بانی کے حوالے سے پیدا ہونے والے یکساں درجے کے مختلف احتمالات میں سے ایک احتمال کی نفی کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے کی ضرورت انھیں آخر کیوں پیش آ گئی؟ کیا اس نکتے کا زیر بحث مسئلے یعنی مسجد اقصیٰ کی تولیت سے کوئی خاص تعلق ہے؟ حضرت ابراہیم کے بجائے حضرت یعقوب کو مسجد اقصیٰ کا بانی تسلیم کر لینے سے صورت حال میں آخر کون سا جوہری فرق پیدا ہو جاتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ محض خامہ فرسائی کا شوق فاضل ناقد کو اس لاطائل بحث میں الجھا دینے کا سبب بن گیا ہے؟

۲۔ فاضل ناقد نے یہ اعتراض بھی اٹھایا ہے کہ ہم نے ابن قیم اور ابن کثیر کی مذکورہ رائے کی تعبیر اس درجہ غلط کی ہے کہ وہ اس کے لیے ''تحریف'' کا لفظ استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس ''تحریف'' کی تفصیل کرتے ہوئے فاضل ناقد نے بتایا ہے کہ ابن قیم نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو مسجد اقصیٰ کا بانی قرار دیتے ہوئے 'اسسہ' (انھوں نے اس کی بنیاد رکھی) کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اور ابن کثیر نے اس بات کو 'جعلہ مسجدا' (انھوں نے اس کو مسجد قرار دیا) کے الفاظ سے بیان کیا ہے، جبکہ ہم نے اس مفہوم کی تعبیر ''مسجد اقصیٰ کے مقام کی تعیین کرنے'' سے کر دی ہے۔ فاضل ناقد نے قارئین کی ذہانت کو اپنی ذہانت پر قیاس کرتے ہوئے ''کسی مسجد کی بنیاد رکھنے'' یا ''کسی جگہ کو مسجد قرار دینے'' اور ''مسجد کے مقام کی تعیین کرنے'' کے مابین پائے جانے والے زمین وآسمان کے فرق پر روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بہرحال فاضل ناقد کی 'دقیقہ رسی' کو تسلیم کرنے سے کوئی چارہ نہ پاتے ہوئے ہم صرف اتنا اضافہ کرنا چاہیں گے کہ علماے سلف کی رائے میں اس ''تحریف'' کا ارتکاب علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی کیا ہے، جنھیں علماے حدیث کی فہرست سے خارج کرنے کے لیے فاضل ناقد کے نزدیک غالباً ان کا 'حنفی' ہونا ہی

کافی ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

والجواب علی ما اختارہ ابن القیم ان تعیین مکان المسجد الاقصی کان من ید اسحاق علیه الصلاة والسلام فانه کان غرز وتدا هناك کما فی التوراة. (فیض الباری ۴/ ۳۷۲)

''ابن قیم کی اختیار کردہ توجیہ کی رو سے اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کی جگہ کی تعیین اسحاق علیہ الصلاۃ والسلام کے ہاتھوں کر دی گئی تھی، چنانچہ تورات کے مطابق انھوں نے اس جگہ پر ایک میخ گاڑ دی تھی۔''

فاضل ناقد نے مزید فرمایا ہے کہ حدیث میں وارد ہونے والے لفظ 'وضع' کا معنی از روے لغت 'تعین کرنا' نہیں ہوسکتا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ فاضل ناقد 'تعین کرنے' کا مفہوم کیا سمجھتے ہیں، البتہ ہم نے یہ الفاظ اس جگہ کو مسجد کے طور پر مقرر کر دینے کے مفہوم میں استعمال کیے ہیں اور اس کے لیے 'وضع' کا لفظ عربی زبان میں بالکل موزوں ہے۔ امام اللغہ زمخشری 'اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ' (آل عمران ۳: ۹۶) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ومعنی وضع اللّٰه بیتا للناس انه جعله متعبدا لهم. (الکشاف ۱/ ۱۸۳)

''وضع اللّٰہ بیتا للناس' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو لوگوں کے لیے عبادت گاہ قرار دیا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

زیر بحث توجیہ کی رو سے حدیث میں وارد ہونے والے لفظ 'وضع' کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ حضرت اسحاق یا حضرت یعقوب علیہما السلام نے اس مقام کو عبادت گاہ کے طور پر متعین کر دیا تھا۔ مسجد اقصیٰ کا بانی حضرت یعقوب علیہ السلام کو قرار دینے پر ابن قیم اور ابن کثیر تو فاضل ناقد کے ہاتھوں 'علماے حدیث' میں شامل ہونے کے شرف سے محروم ہو ہی چکے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ زمخشری علماے لغت کے زمرے میں شامل رہتے ہیں یا نہیں۔

۳۔ ابن قیم اور ابن کثیر کی رائے کی جو تعبیر ہم نے اپنے الفاظ میں کی ہے، فاضل ناقد نے اسے ''تحریف'' قرار دیتے ہوئے اپنی گرمیِ گفتار کا باقاعدہ جواز بھی پیش فرمایا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں ان کے سخت لہجے پر ناگواری محسوس نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ ہم نے بھی مسجد اقصیٰ کی تولیت کے بارے میں اپنے ایک اجتہادی موقف کے مقابلے میں ''علما کے کم وبیش اجماع کو کتمان حق اور تکذیب آیات اللہ سے تعبیر'' کیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے ہماری تحریر میں سے جو اقتباس نقل کیا ہے، اس کا پورا پس منظر ہم یہاں واضح کیے دیتے ہیں۔

یہ پیراگراف جس بحث کے سیاق وسباق میں آیا ہے، وہ ''اشراق'' کے جولائی/ اگست ۲۰۰۳ اور ''الشریعہ'' کے ستمبر/ اکتوبر ۲۰۰۳ کے شماروں میں ''عالم عرب کا موقف چند علمی واخلاقی سوالات'' کے عنوان سے شروع ہوتی ہے۔

اس کے آغاز میں ہم نے لکھا ہے:

''مسجد اقصیٰ کی تولیت کے حوالے سے مذکورہ دونوں نقطہ ہاے نظر کی کمزوری ہم واضح کر چکے ہیں، تاہم اختلاف کے باوجود یہ ماننا چاہیے کہ ان کی غلطی اصلاً علمی ہے اور غلط فہمی کے اسباب بھی بڑی حد تک قابل فہم ہیں۔ لیکن بے حد افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس باب میں امت مسلمہ کے رویے کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کی مشکل ہی سے کوئی علمی یا اخلاقی توجیہ کی جا سکتی ہے۔''

اس ناقابل توجیہ رویے کی تفصیل کرتے ہوئے ہم نے لکھا ہے:

''اس وقت امت مسلمہ کی نمائندگی کرنے والے مذہبی وسیاسی رہنماؤں، صحافیوں اور ماہرین تاریخ کی اکثریت سرے سے ہیکل سلیمانی کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے نزدیک ہیکل کا وجود محض ایک افسانہ ہے جو یہود نے مسجد اقصیٰ پر قبضہ کرنے کے لیے گھڑ لیا ہے۔''

اس موقف کے ترجمان رہنماؤں کے بیانات نقل کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا ہے:

''قرآن وسنت کی تصریحات، مسلمہ تاریخی حقائق، یہود ونصاریٰ کی مذہبی روایات، مسلمانوں کے تاریخی لٹریچر اور مسلم محققین کی تصریحات کی روشنی میں نہ اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجایش ہے کہ مسجد اقصیٰ دراصل ہیکل سلیمانی ہی ہے، نہ اس دلیل میں کوئی وزن ہے کہ اثریاتی تحقیق کے نتیجے میں مسجد اقصیٰ کے نیچے ہیکل سلیمانی کے کوئی آثار دریافت نہیں ہو سکے اور نہ ہی اس حسن ظن کے لیے کوئی قرینہ ہے کہ مذکورہ موقف کے وکلا شاید حقائق سے بے خبر ہیں یا کوئی غلط فہمی انھیں لاحق ہو گئی ہے۔ خود فلسطین کے مسلم رہنما اسرائیل کے وجود میں آنے اور بیت المقدس پر صیہونی قبضے سے قبل تک ان تاریخی حقائق کو تسلیم کرتے رہے ہیں اور انھیں جھٹلانے کی جسارت انھوں نے کبھی نہیں کی۔''

یہ وہ بحث ہے جس کا اختتام ہم نے درج ذیل سوال پر کیا ہے:

''یہ نکتہ اب اہل علم کے لیے ایک کھلے سوال کی حیثیت رکھتا ہے کہ عالم عرب کا یہ کم وبیش اجماعی موقف، جس کو متعدد اکابر علماے دین ومفتیان شرع متین کی تائید ونصرت حاصل ہے اور جس کو مسلم اور عرب میڈیا تسلسل کے ساتھ دہرا رہا ہے، کتمان حق اور تکذیب آیات اللہ کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں؟''

اس تفصیل سے واضح ہے کہ جہاں تک مسجد اقصیٰ پر بنی اسرائیل کے حق تولیت کے منسوخ ہو جانے کی رائے کا تعلق ہے، ہم نے اس رائے سے اختلاف کے باوجود اسے ایک ''علمی غلطی'' کہا ہے اور اس کے پیدا ہونے کے اسباب کو بھی قابل فہم قرار دیا ہے۔ البتہ عالم عرب کے موجودہ سیاسی ومذہبی رہنماؤں نے پوری ''روشن ضمیری'' کے ساتھ ہیکل سلیمانی کی تاریخی حیثیت یا اس کے محل وقوع کے بارے میں مذہبی وتاریخی مسلمات کا انکار کرنے کی جو

روش اختیار کر رکھی ہے، اس کی سنگینی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا یہ موقف ''کتمان حق اور تکذیب آیات اللہ کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں''۔ اب اسے چاہے فاضل ناقد کی ذہانت کا کمال سمجھ لیا جائے یا ان کی دیانت داری کا کہ انھوں نے ہمارے اس تبصرے کو مذکورہ پوری بحث اور بالخصوص اس کے پہلے پیرا گراف سے کاٹ کر اہل علم کے اس موقف کے ساتھ نتھی کر دیا ہے جسے ہم خود ایک ''علمی غلطی'' قرار دے رہے ہیں۔ علماے سلف کی آرا میں ہمارے قلم سے صادر ہونے والی جس ''تحریف'' کی انھوں نے نشان دہی کی ہے، اس پر وہ یقیناً داد کے مستحق ہیں، لیکن خود اپنے اس 'معصومانہ تسامح' کے بارے میں وہ کیا ارشاد فرمائیں گے؟

۴۔ فاضل ناقد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ صخرۂ بیت المقدس کو قبلہ مقرر کر لینا محض یہود کی اپنی ''اختراع'' ہے جسے اللہ تعالیٰ یا اس کے نبیوں کی طرف سے سند تصدیق حاصل نہیں۔ اس دعوے کی تائید میں انھوں نے امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہما اللہ کی عبارات پیش کی ہیں۔ بدقسمتی سے یہاں بھی موضوعیت ان پر اتنی غالب ہے کہ انھوں نے دونوں بزرگوں کی عبارات پر پوری طرح غور کیے اور ان کے مدعا اور منشا کو ٹھیک طرح سے سمجھے بغیر انھیں اس دعوے کا مدعی ظاہر کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن تیمیہ اور ابن قیم ان عبارات میں مسجد اقصیٰ کے بنی اسرائیل کا شرعی لحاظ سے مستند قبلہ ہونے کی نفی نہیں کر رہے، بلکہ ''کعبہ'' کے تقابل میں، جسے اللہ تعالیٰ کے براہ راست حکم کے تحت روز اول سے قبلہ مقرر کر دیا گیا تھا، مسجد اقصیٰ کے ''قبلہ'' قرار پانے کے تاریخی عمل اور اس کے مختلف مراحل کو بیان کر رہے ہیں۔ ان کی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دراصل براہ راست صخرہ کو قبلہ بنانے کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ بنی اسرائیل کے لیے قبلہ کی حیثیت خیمۂ اجتماع کو حاصل تھی جس میں مقدس اشیا اور تبرکات پر مشتمل تابوت کو رکھا جاتا تھا۔ مسجد اقصیٰ کی تعمیر کے بعد اس تابوت کو صخرۂ بیت المقدس کے مقام پر رکھ دیا گیا اور بنی اسرائیل اسی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ بعد میں تاریخی حوادث کے نتیجے میں تابوت ضائع ہو گیا تو اس جگہ یعنی صخرہ کو، جس پر تابوت رکھا گیا تھا، قبلے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہما اللہ کی بات بس اتنی ہے اور اس سے مسجد اقصیٰ کے مستند شرعی قبلہ نہ ہونے کا جو نتیجہ فاضل ناقد نے اخذ کیا ہے، وہ دونوں بزرگوں کے کلام سے صریح تجاوز پر مبنی اور سراسر موضوعیت کا شاخسانہ ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ بنی اسرائیل میں انبیا کا سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد رکے بغیر مسلسل جاری رہا ہے، اس لیے خیمۂ اجتماع کو ان کا قبلہ مقرر کرنے، پھر مسجد اقصیٰ میں صخرہ کی جگہ پر اس کو رکھنے اور تابوت کے ضائع ہو جانے کے بعد صخرہ کو قبلے کی حیثیت دینے کا یہ سارا عمل انبیا کی رہنمائی میں اور ان کی تائید ہی سے مکمل ہوا۔ اس لحاظ سے اس عمل کو پورا شرعی استناد حاصل ہے اور ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہما اللہ میں سے کوئی بزرگ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بھی اس کی نفی نہیں فرما رہے۔ چنانچہ دیکھیے، ابن تیمیہ نے کعبہ کو حضرت ابراہیم اور ان سے پہلے کے انبیا کا قبلہ تو قرار دیا ہے، لیکن ان کے بعد کے انبیا کے لیے کعبہ ہی کے ''قبلہ'' ہونے کی، جیسا کہ فاضل ناقد کا اصرار ہے، نہ کوئی تصریح کی ہے اور نہ اشارہ۔ جبکہ ابن قیم نے تو اس بات کی باقاعدہ تصریح کی ہے کہ بنی اسرائیل اور انبیاے بنی اسرائیل کے ''قبلہ'' کی حیثیت مسجد اقصیٰ ہی کو حاصل رہی ہے۔ ''ہدایۃ الحیاریٰ' میں لکھتے ہیں:

وما صلی المسیح الی الشرق قط وما صلی الی ان توفاه اللّٰہ الا الی بیت المقدس وھی قبلة داود والانبیاء قبله وقبلة بنی اسرائیل. (۱۶۷)	''مسیح علیہ الصلاۃ والسلام نے کبھی مشرق کی طرف رخ کر کے نماز نہیں پڑھی۔ وہ اپنے قبض کیے جانے تک بیت المقدس ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے جو حضرت داؤد کا اور حضرت مسیح سے پہلے آنے والے انبیا اور بنی اسرائیل کا قبلہ تھا۔''

۵۔ فاضل ناقد نے بنی اسرائیل کے لیے مسجد حرام ہی کے قبلہ مقرر کیے جانے کے حق میں یہ استدلال کیا ہے کہ سورۂ بقرہ، آیت ۱۳۲ کے مطابق حضرت یعقوب نے اپنی اولاد یعنی بنی اسرائیل کو 'ملت ابراہیم'' یعنی دین اسلام کی پیروی کی وصیت فرمائی تھی۔ گویا فاضل ناقد کے نزدیک دین اسلام یا ملت ابراہیم کی پیروی میں اس قبلے کی پیروی بھی لازمی طور پر شامل ہے جس کا حکم ان کے خیال میں حضرت ابراہیم اور ان سے پہلے تمام انبیا کو دیا گیا تھا۔

فاضل ناقد نے یہ استدلال پیش کرتے ہوئے کس قدر گہرے غور وفکر سے کام لیا ہے، اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے کے لیے ہمیں ان کے اس مضمون کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس میں انھوں نے جناب جاوید احمد غامدی کے ''تصور سنت'' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ غامدی صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دین اسلام کے ماخذ میں 'سنت' سے مراد دین ابراہیمی میں مقرر کیے جانے والے اعمال ورسوم کی وہ روایت ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدید و اصلاح اور بعض اضافوں کے ساتھ دین کی حیثیت سے امت مسلمہ میں جاری فرمایا۔ ان کی رائے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلاً حضرت ابراہیم ہی کے دین وملت اور اس کے احکام ورسوم کی پابندی کا حکم دیا گیا تھا اور اس کے لیے انھوں نے سورۂ نحل کی آیت ۱۲۳: 'ثم اوحینا الیك ان اتبع ملة ابراھیم حنیفا' سے استدلال کیا ہے[1]۔ فاضل ناقد نے اس استدلال پر تنقید کرتے ہوئے ''الشریعہ'' کے ستمبر ۲۰۰۶ کے شمارے میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ 'ملت ابراہیم' کی پیروی سے شرائع واحکام کی پیروی مراد نہیں ہو سکتی، کیونکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۰ میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ ملت ابراہیم کی اتباع نہیں کرتے، وہ بے وقوف ہیں۔ فاضل ناقد لکھتے ہیں:

---

[1] اصول ومبادی، ۱۰۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''ومن یرغب عن ملة ابراھیم الا من سفه نفسه' سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر ہم ملت ابراہیم کی اتباع سے جزئیات میں ان کی اتباع مراد لیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ جن انبیا نے جزئیات میں حضرت ابراہیم کی اتباع نہیں کی، معاذ اللہ وہ بے وقوف ہیں۔ حضرت ابراہیم کی ملت کی اتباع سے مراد یہاں بھی ان کے اس رویے کی پیروی ہے جو انھوں نے اللہ کی اطاعت کے معاملے میں پیش کیا، یعنی اللہ کے لیے انتہائی درجے میں فرمانبرداری اختیار کرنا۔'' (الشریعہ، ستمبر ۲۰۰۶، ۱۸)

فاضل ناقد کی اس تنقید سے اتفاق ضروری نہیں، لیکن ان کی اس رائے کو سامنے رکھتے ہوئے مسجد حرام کو بنی اسرائیل کا قبلہ مقرر کرنے کے حق میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۲ سے ان کے استدلال کا جائزہ لیجیے تو یہ دل چسپ صورت حال سامنے آتی ہے کہ اس آیت میں حضرت یعقوب کی طرف سے اپنی اولاد کو جس چیز پر کار بند رہنے کی وصیت کا ذکر ہے، وہ اس سے پچھلی آیت میں مذکور وہی 'ملة ابراھیم' ہے جس کے مفہوم کو فاضل ناقد مذکورہ اقتباس میں صرف توحید اور اطاعت اور فرماں برداری کے رویے تک محدود قرار دے چکے ہیں، لیکن جب خود انھیں مسجد حرام کو بنی اسرائیل کا قبلہ قرار دینے کے حق میں استدلال کی ضرورت پیش آئی ہے تو اسی 'ملة ابراھیم' کا سکڑا ہوا دائرہ وسیع ہو گیا ہے اور نماز اور حج کے لیے قبلہ ومرکز مقرر کرنے جیسے شرعی احکام بھی اس کے اندر شامل ہو گئے ہیں۔ کیا فاضل ناقد اپنی ان 'محققانہ اداؤں' پر غور کرنا پسند کریں گے؟

فاضل ناقد کے ''تاریخی وتحقیقی جائزے'' میں نادر نکات اور اچھوتے استنباطات کا استقصا یہاں مقصود نہیں، ورنہ ان کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ابھی داد طلب ہے۔ ہم اس امید پر گفتگو کو یہاں ختم کر رہے ہیں کہ آں محترم محض ہماری ضمنی طور پر پیش کردہ گزارشات کو موضوع سخن نہیں بنائیں گے، بلکہ اصل نکتۂ اختلاف یعنی مسجد اقصیٰ کی تولیت کی شرعی حیثیت کے حوالے سے بھی علما کے استدلال پر ہماری تنقید کو، جو ان کی نظر عنایت کی منتظر ہے، اپنی فاضلانہ توجہ سے نوازیں گے۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد عمار خان ناصر

مدیر 'محدث' کے نام جناب عمار خان ناصر کا مکتوب

[یہ ''المورد'' کے شعبۂ تصنیف و تالیف کے رکن اور ماہنامہ ''الشریعہ'' کے مدیر جناب عمار خان ناصر کا مکتوب ہے جو انھوں نے معاصر ماہنامہ ''محدث'' کے مدیر کے نام تحریر کیا ہے۔ اس میں مسجد اقصیٰ کی تولیت زیر بحث ہے، چنانچہ اس موضوع پر شامل اشاعت تنقیدی مکالمے کے ساتھ یہ خط بھی شائع کیا جا رہا ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

برادر محترم حافظ حسن مدنی صاحب، مدیر ماہنامہ ''محدث'' لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے، مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

''محدث'' کے مارچ ۲۰۰۷ کے شمارے میں ''مسجد اقصیٰ صیہونیوں کے نرغے میں'' کے زیر عنوان آپ کا تفصیلی اور معلوماتی اداریہ پڑھنے کو ملا اور اس بات پر خوشگوار حیرت ہوئی کہ میں نے ''الشریعہ'' کے ستمبر/ اکتوبر ۲۰۰۳ اور اپریل/ مئی ۲۰۰۴ کے شماروں میں شائع ہونے والی اپنی تفصیلی تحریروں میں شرعی زاویۂ نگاہ سے اس معاملے کے جس بنیادی پہلو کی طرف اہل علم کی توجہ مبذول کرائی تھی، آپ کی تازہ تحریر میں اس کو تسلیم کرتے ہوئے مسجد اقصیٰ کے حوالے سے ایک ایسا موقف اختیار کیا گیا ہے جو امت مسلمہ کے مروجہ جذباتی، غیر اخلاقی اور غیر شرعی موقف سے بالکل مختلف ہے اور جس سے، صورت حال کے واقعی تجزیے اور حکمت عملی کے بعض پہلوؤں سے قطع نظر، کوئی اصولی اختلاف غالباً نہیں کیا جا سکتا۔ میری پوری بحث کا حاصل یہی تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کردہ ہیکل سے، جسے قرآن مجید نے ''مسجد اقصیٰ'' کے نام سے یاد کیا ہے، بنی اسرائیل کے حق تولیت کو از روے شریعت منسوخ قرار

دینے کا تصور اور اس کی بنیاد پر تقریباً ۱۵۰۰ فٹ لمبے اور ۱۰۰۰ فٹ چوڑے موجودہ احاطۂ ہیکل (Temple Mount) کے پورے رقبے اور بالخصوص اس کے وسط میں موجود صخرۂ بیت المقدس اور اس پر اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کے تعمیر کردہ 'قبۃ الصخرۃ' کو بلا شرکت غیرے مسلمانوں کی ملکیت قرار دینے کا دعویٰ شرعی و اخلاقی لحاظ سے درست نہیں، اس لیے مسلمانوں کو اپنا دعویٰ استحقاق تاریخی و واقعاتی بنیاد پر اس احاطے کی جنوبی دیوار کے ساتھ قائم اس مسجد تک محدود رکھنا چاہیے جہاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فتح بیت المقدس کے موقع پر نماز ادا کر کے اسے مسلمانوں کی عبادت کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ (یہ مسجد خود سیدنا عمر نے تعمیر نہیں فرمائی تھی، بلکہ بعد کے دور میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ ہے۔ ابتدا میں اسے 'مسجد عمر' کا نام دیا گیا تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ 'مسجد اقصیٰ' ہی کے نام سے معروف ہو گئی، جو ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی ذکر کردہ 'مسجد اقصیٰ' یعنی حضرت سلیمان کی تعمیر کردہ مسجد سے مختلف ایک اصطلاح ہے)

آپ نے اپنی تحریر میں اس بنیادی نکتے کو تسلیم فرماتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس مسجد پر مسلمانوں کے استحقاق کی وجہ تاریخی طور پر یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے اس مقام پر مسجد کو تعمیر کیا تھا تو اس وقت یہ جگہ ویران تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود یہاں سے کوڑا کرکٹ صاف کر کے اس مسجد کو قائم کیا تھا۔ خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ جیسا عادل حکمران کسی اور قوم کی عبادت گاہ پر اسلامی مرکز تعمیر کر کے کسی دوسری قوم کا مذہبی حق غصب کرے گا۔'' (محدث، مارچ ۲۰۰۷، ۵)

> ''اگر یہود اس علاقے میں کوئی ہیکل تعمیر کرنا بھی چاہتے ہیں جس سے ان کے مذہبی جذبات وابستہ ہیں تو اس کے لیے مسجد اقصیٰ کا انہدام کیوں ضروری ہے اور وہ عین اس مقام پر ہی کیوں تعمیر ہوتا ہے جہاں یہ مقدس عمارت موجود ہے؟ مسجد اقصیٰ کے احاطے میں شمال مغربی حصہ اور دیگر بہت سے حصے بالکل خالی ہیں، وہاں وہ قبہ بھی ہے جس کے بارے میں اکثر مسلم علما کا موقف یہ ہے کہ اس قبۂ صخرہ کی کوئی شرعی فضیلت نہیں، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں نماز پڑھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ یوں بھی یہود کے ہاں قبلہ کی حیثیت اس کو حاصل رہی ہے کیونکہ انھوں نے خیمۂ اجتماع کو اپنا قبلہ بنایا ہوا تھا جو قبۂ صخرہ کے مقام سے اٹھا لیا گیا، چنانچہ قبۂ صخرہ کو اس کا آخری مقام ہونے کے ناتے انھوں نے اسے ہی اپنا قبلہ قرار دے لیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہود قبۂ صخرہ پر کوئی تصرف کرنے کی بجائے سارا زور مسجد اقصیٰ پر ہی صرف کر رہے ہیں؟'' (۱۸)

ان اقتباسات کی روشنی میں میرے ناقص فہم کے مطابق نتیجے کے اعتبار سے آپ کے موقف اور میرے نقطۂ نظر میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ البتہ اس کے ساتھ اپنی تحریر کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

> ''امت مسلمہ کے فرزند آج ۴۰ برس گزرنے کے بعد بھی نہ صرف مطمئن و پر سکون ہیں، بلکہ آہستہ آہستہ کوتاہی اور

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مداہنت یوں اپنا اثر دکھا رہی ہے کہ مسلمانوں میں بعض ایسے کرم فرما بھی پیدا ہو گئے ہیں جو مسجد اقصیٰ کو اسی طرح یہود کی تولیت میں دے دینے کے داعی ہیں جیسے مسلمانوں کے پاس بیت اللہ الحرام کی تولیت ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔''(۲۰)

اگر یہ اشارہ —— جیسا کہ گمان غالب ہے —— میری تحریروں کی طرف ہے تو میں، فی الواقع، آپ کی اس تعریض کا مدعا نہیں سمجھ سکا۔ اگر مسجد اقصیٰ سے آپ کی مراد حضرت سلیمان علیہ السلام کا تعمیر کردہ ہیکل ہے جس کا محل وقوع قبۃ الصخرہ کے قریب ہے تو اس پر تصرف اور تولیت کی اجازت، بلکہ ترغیب تو آپ خود بھی یہود کو دے رہے ہیں، اور اگر اس سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مخصوص کردہ مقام پر تعمیر کی جانے والی مسجد یعنی موجودہ 'مسجد اقصیٰ' ہے تو میری تحریر میں کہیں بھی اس کی تولیت یہود کے سپرد کر دینے کی بات نہیں کہی گئی، بلکہ ''الشریعہ'' کے اپریل/ مئی ۲۰۰۴ کے شمارے میں، میں نے اس بحث کا اختتام ہی اس نکتے پر کیا ہے کہ:

''مسلمانوں کو پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے موجودہ موقف پر نظر ثانی کرتے ہوئے ان بے بنیاد مذہبی تصورات کو خیر باد کہنا ہوگا جو پوری عبادت گاہ سے یہود کے حق تولیت کی تنسیخ یا قبۃ الصخرہ کی اہمیت وتقدس کے حوالے سے وضع کر لیے گئے ہیں اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کی اتباع میں اپنے حق کو اس جگہ تک محدود ماننا ہوگا جہاں روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کا تذکرہ ملتا ہے اور جسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی عبادت کے لیے مخصوص فرما دیا تھا۔''(۴۷)

آپ کے مضمون میں اٹھائے جانے والے بعض قانونی نکات اور واقعاتی تفصیلات پر بحث واختلاف کی گنجایش موجود ہے، لیکن ان سے قطع نظر کرتے ہوئے موجودہ مسجد اقصیٰ کے انہدام کے حوالے سے جن صیہونی عزائم کا آپ نے ذکر کیا ہے، وہ اگر درست ہیں تو یقیناً امت مسلمہ کو اپنے حق کا دفاع پوری جرات اور استقامت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ خدا کرے کہ امت مسلمہ کے دل میں ''اپنے حق'' کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ''نفس حق'' کو پہچاننے اور اس کو تسلیم کرنے کا جذبہ بھی بیدار ہو جائے۔

محترم حافظ عبد الرحمٰن مدنی صاحب اور ادارہ کے دیگر رفقا کی خدمت میں سلام اور آداب عرض ہے۔

محمد عمار خان ناصر

گوجرانوالہ

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد رفیع مفتی

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سزا کا فرق

سوال: دنیا میں جرم کی سزا پانے کے حوالے سے امیر اور غریب میں اور صاحب اقتدار اور مجبور و بے کس میں فرق کیوں ہے؟ (راجہ عبدالرحمٰن میمن)

جواب: خدا نے یہ دنیا آزمایش کے لیے بنائی ہے۔ چنانچہ اس نے اس میں یہ گنجایش رکھی ہے کہ یہاں اگر کوئی اپنے دائرۂ اختیار میں عدل کرنا چاہے تو وہ عدل کر سکے اور ظلم کرنا چاہے تو ظلم کر سکے، نیکی کرنا چاہے تو نیکی کر سکے اور بدی کرنا چاہے تو بدی کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں صاحب اقتدار افراد عام طور پر اپنے متعلقین کو جرائم کی سزا پانے سے بچا لیتے ہیں، لیکن اسی دنیا میں یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض صاحب اقتدار افراد خدا سے ڈرتے ہیں اور وہ ایسا نہیں کرتے۔ خدا کے نزدیک یہ افراد اتنے قیمتی ہوتے ہیں کہ وہ انھیں اپنی جنت کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ اس نے اسی مقصد کی خاطر یہ آزمایش گاہ بنائی ہے۔

چنانچہ آدمی کو پریشان ہونے کے بجائے یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم خود اپنے دائرۂ اختیار میں خداخوفی سے کام لے رہے ہیں یا نہیں، کیونکہ بس ابھی عدالت لگنے والی ہے اور ابھی فیصلہ ہونے والا ہے۔ وقت تیزی سے گزرتا چلا جا رہا ہے۔ ہر آدمی مسلسل اپنا اعمال نامہ لکھ رہا ہے، وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رک رہا، پھر جب موت کا فرشتہ آتا ہے تو وہ اپنا اعمال نامہ لکھنا بند کر دیتا ہے، بغیر کسی سے بات کیے چپ چاپ اس کے ساتھ چل دیتا ہے اور پھر وہ کبھی واپس نہیں آتا، پھر وہ کسی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا۔ ہر آدمی ایسے ہی کر رہا ہے۔ دنیا کی یہ کہانی کتنی عجیب ہے۔ بس لازم ہے کہ ہر آدمی اپنی فکر کرے۔

پابند صلوٰۃ راشی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سوال: اس شخص کے بارے میں دین کیا کہتا ہے جو پنج وقتہ نماز ادا کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ رشوت بھی لیتا اور دھوکا بھی دیتا ہے؟ (راجہ عبدالرحمٰن میمن)

جواب: حرام رزق کے ساتھ جو نماز پڑھی جاتی ہے، وہ اللہ کے ہاں قبولیت نہیں پاتی۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ انسان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جس عمل کے ساتھ بھی دل کی گہرائی کے ساتھ چپکا ہو، وہی عمل بالآخر دوسرے اعمال پر غلبہ پا لیتا ہے۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ اس وقت اس شخص کی نماز سچے عابد کی نماز نہیں ہے، کیونکہ خدا کا سچا بندہ اپنے دل سے خدا کا فرماں بردار بھی ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ شخص اپنے جرائم کو دل سے ناگوار جانتا، خود کو غلط قرار دیتا اور اللہ کے سامنے شرمندہ ہوتا رہتا ہے، تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کی نماز اس کی بداعمالیوں پر غلبہ پا لے، یہ توبہ کر لے اور اچھے انجام کو پہنچے۔ البتہ، اگر معاملہ برعکس ہوا تو پھر توقع بھی برعکس ہی کی ہے، کیونکہ ارشاد باری ہے:

> ''البتہ جس نے کمائی کوئی بدی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔'' (البقرہ ۲:۸۱)

یعنی انسان خواہ کیسا ہی نمازی یا روزے رکھنے اور حج کرنے والا کیوں نہ ہو، اگر اس نے کسی ایک برائی کو اس طرح اختیار کر لیا کہ وہ برائی اس پر چھا گئی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو اب اس کی سب

نیکیاں برباد ہو جائیں گی اور وہ جہنم میں جائے گا۔

بنک اور نیشنل سیونگ اسکیموں کا سود

سوال: نفع ونقصان میں شراکت کے تصور سے کی گئی سرمایہ کاری پر ملنے والا منافع اگر سود نہیں تو بنک میں جمع شدہ رقم پر ملنے والے منافع کو سود کیسے کہا جا سکتا ہے، جبکہ بنک کے دیوالیہ ہو جانے کا امکان ہوتا ہے اور ایسی صورت میں رقوم جمع کرانے والوں کو بنک کے ساتھ نقصان میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح اگر بنک کے deposits ایک خاص حد سے کم ہو جائیں، تب بھی اکاؤنٹ ہولڈرز کو کچھ گھاٹا اٹھانا پڑتا ہے، چنانچہ اس صورت میں یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ اکاؤنٹ ہولڈرز بنک کے نفع ونقصان میں شریک ہیں اور انھیں ملنے والا منافع سود نہیں ہے؟ (محمد عامر چوہدری)

جواب: بنک اپنے اکاؤنٹ ہولڈرز کو اپنے کاروبار میں نفع ونقصان کی شرائط پر شریک نہیں کرتا، بلکہ وہ انھیں ان کی جمع شدہ رقوم پر متعین مدت میں متعین اضافہ کی یقین دہانی کراتا ہے۔ اسی کو سود اور ربا کہتے ہیں۔

بنک کے دیوالیہ ہو جانے پر اکاؤنٹ ہولڈرز کی رقموں کا ٹوٹ جانا یا ان کو نقصان ہو جانا یا اس طرح کی بعض دوسری صورتوں میں انھیں گھاٹا پڑنا، کاروبار کا نفع ونقصان نہیں ہے، بلکہ یہ بنک سے متعلق افراد پر آفات وحوادث کی صورت میں ہونے والے اثرات ہیں۔ بنک بہرحال، سودی نظام پر مبنی ادارہ ہے۔ اسے معلوم ہے کہ نفع ونقصان میں شراکت کیا ہوتی ہے۔ وہ نفع ونقصان کی شرائط پر لوگوں کو اپنے ساتھ شریک نہیں کرتا، بلکہ سود کے اصول پر ان سے رقوم لیتا اور انھیں دیتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کی باتوں سے خود کو دھوکا نہیں دینا چاہیے۔

اسی طرح وہ سب نیشنل سیونگ اسکیمیں جو متعین رقم پر متعین مدت میں متعین اضافہ دیتی ہیں، وہ بھی ظاہر ہے کہ سود ہی دیتی ہیں۔ اسلام کے نزدیک ایسی اسکیموں سے فائدہ اٹھانا حرام ہے۔ رہا کسی کا انفرادی مسئلہ کہ اس کے پاس اس حرام سے فائدہ اٹھانے کا عذر موجود ہے، تو بے شک معذور اور مجبور آدمی اپنی ضرورت کی حد تک دل کے گریز اور ناپسندیدگی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com

سنت کی تعریف میں اختلاف

سوال: سنت کی تعریف میں اس قدر اختلاف کیوں ہے؟ لوگوں کی اکثریت کیوں سنت کی کلاسیکل تعریف ہی کی قائل ہے، جبکہ غامدی صاحب کے نزدیک سنت کی تعریف اس سے مختلف ہے؟

(محمد علی سجاد خان)

جواب: پوری امت اس پر متفق ہے کہ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی طرف سے دین کے طور پر علم بھی دیا ہے اور عمل بھی، یہی علم وعمل صحابہ سے تابعین نے لیا اور پھر ان سے آگے یہ پوری امت میں پھیلا ہے۔ چنانچہ اس پہلو سے علما میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

جب علما نے اس دین کو مدون کرنا شروع کیا تو اس وقت مختلف اصطلاحات کا مسئلہ پیدا ہوا، سنت کا لفظ بھی انھی اصطلاحات میں سے ایک ہے۔ بعض علما نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور آپ کے اعمال کو سنت کا نام دیا، بعض نے آپ کی احادیث کو سنت کا نام دیا۔ غامدی صاحب کے نزدیک بطور اصطلاح سنت کے لفظ کو عملی تواتر سے ملنے والے ان دینی اعمال کے لیے بولا جانا چاہیے جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں جاری کیا تھا۔ چنانچہ وہ اصطلاحاً انھی کو سنت قرار دیتے ہیں۔

سنت کا یہی لفظ ایک دوسری اصطلاح کے طور پر بھی بولا گیا ہے، یعنی بعض علما نے ان نوافل کو بھی سنت کہا ہے جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض کے بعد یا ان سے پہلے تطوعاً پڑھا ہے۔ اصطلاحاً سنت کا لفظ کس چیز پر بولنا چاہیے، اس میں محققین کی آرا مختلف ہو سکتی ہیں اور وہ مختلف ہیں۔ رہی یہ بات کہ انسانوں کی اکثریت سنت کی کلاسیکل تعریف ہی کی قائل کیوں ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ سنت کا لفظ اپنے جن اصطلاحی معنوں میں ایک لمبے عرصے سے بولا جاتا رہا ہے، ظاہر ہے کہ لوگ اسی کے قائل ہوں گے۔ غامدی صاحب نے سنت کو جن اصطلاحی معنوں میں بولا ہے، اگر امت کے نزدیک یہ زیادہ موزوں ہوئی تو ان شاء اللہ وہ اسے قبول کر لے گی۔

بیوہ کی عدت

سوال: عدت سے کیا مراد ہے؟ اس میں عورت پر کیا پابندیاں ہوتی ہیں؟ بعض لوگ بڑی عمر کی خواتین

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟ (فاروق عالم صدیقی)

جواب: عدت کا حکم سورۂ بقرہ کی درج ذیل آیات میں بیان ہوا ہے:

''اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑیں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن انتظار کرائیں۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اپنے بارے میں جو کچھ دستور کے مطابق وہ کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔'' (۲: ۲۳۴)

عدت کا لفظ اصطلاح میں اس مدت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں بیوی شوہر کی طرف سے طلاق یا اس کی وفات کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔ یہ مدت اصلاً اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ عورت کے پیٹ کی صورت حال پوری طرح واضح ہو جائے۔ شوہر کی وفات کی صورت میں یہ عدت چار ماہ دس دن ہے۔ اگر کوئی عورت اپنے مرحوم شوہر کے گھر میں یہ عدت گزارتی ہے تو پھر اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یہ سارا عرصہ سوگ ہی کی کیفیت میں گزارے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''بیوہ عورت رنگین کپڑے نہیں پہنے گی، نہ زرد، نہ گیرو سے رنگے ہوئے۔ وہ زیورات استعمال نہیں کرے گی اور نہ مہندی اور سرمہ لگائے گی۔'' (ابوداؤد، رقم ۲۳۰۴)

یہ عدت بڑی عمر کی خواتین کو بھی گزارنی ہوگی۔ حاملہ عورت کی عدت وضع حمل تک ہے اور بیوہ غیر مدخولہ کے لیے کوئی عدت نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سود پر قرض لینا

سوال: ہمارے ملک میں جو کاروبار بھی کیا جائے، اس کے لیے بنک سے سود پر قرض لینا پڑتا ہے۔ کیا سود دینا بھی اسلام میں اسی طرح ممنوع ہے جیسے کہ سود لینا؟ (سلیمان)

جواب: بنک وغیرہ سے سود پر قرض لینا جائز ہے۔ اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ شریعت نے سود کھانے یعنی سود لینے سے منع کیا ہے، سود دینے سے نہیں۔

حدیث میں سود کھلانے والے کو بھی سود لینے والے ہی کی طرح مجرم قرار دیا گیا ہے۔ یہ سود کھلانے والا کون ہے۔ بعض علما نے سود دینے والے ہی کو سود کھلانے والا قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ سود کھلانے والا

دراصل وہ ایجنٹ ہے، جو سود خور کے لیے گاہک لاتا، اس کی نمائندگی کرتا اور اس کے سودی نظام کو چلاتا ہے۔

بنکوں کے شیئر

سوال: کیا اسٹاک ایکسچینج میں بنکوں کے شیئر خریدنا حرام ہے، جبکہ ان کی قیمتیں اوپر نیچے ہوتی رہتی ہیں اور ان پر جو منافع دیا جاتا ہے وہ بھی کم اور زیادہ ہوتا رہتا ہے؟ اس صورت میں کیا یہ نفع ونقصان جیسی چیز نہیں بن جاتی؟ (سلیمان)

جواب: بنک ایک ایسا ادارہ ہے جو اصلاً سودی کاروبار کرتا ہے، یعنی وہ کچھ لوگوں سے سود کی کم شرح پر رقم لیتا اور دوسرے لوگوں کو وہی رقمیں سود کی زیادہ شرح پر دیتا ہے۔ یہی اس کا اصل کاروبار ہے اور اسی سے وہ اپنا منافع کماتا ہے۔ لہٰذا، اس کی کمائی بھی حرام ہے اور اس میں حصہ دار بننا بھی حرام ہے۔

جب آپ کسی بنک کے شیئر ہولڈر بنتے ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ اس کے مالکان میں سے ایک فرد ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مارکیٹ میں بنک کے شیئرز کی قیمت کبھی کم ہوتی ہے اور کبھی زیادہ اور ان شیئرز پر جو منافع ہوتا ہے، وہ بھی یکساں نہیں رہتا۔ بہرحال، یہ شیئر ہولڈر بنک کے مالکان میں سے ہے اور وہ اپنے سودی ادارے سے اپنا نفع حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا، ہمارے خیال میں بنک کے شیئرز لینے سے ضرور بچنا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ازواج اور اولاد کا دشمن ہونا

سوال: قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے کہ تمھاری بیویوں اور تمھارے بچوں میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں۔ اس بات کا کیا مطلب ہے؟ (تلاوت شاہ)

جواب: قرآن مجید میں یہ بات ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

''اے ایمان والو، تمھاری بیویوں اور تمھاری اولاد میں سے بعض تمھارے لیے دشمن ہیں، تو ان سے بچ کر رہو، اور اگر تم انھیں معاف کرو گے، درگزر کرو گے اور بخشو گے تو اللہ غفور ورحیم ہے۔ تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھارے لیے امتحان ہیں اور اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔'' (التغابن ۶۴: ۱۴۔ ۱۵)

پہلی بات یہ ہے کہ ان آیات میں ازواج اور اولاد کے لیے دشمن کا لفظ حقیقی معنوں میں نہیں، بلکہ نتیجے کے حوالے سے بولا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان میں دراصل، انسان کو اس بڑی آزمایش سے متنبہ فرمایا گیا ہے کہ بعض اوقات خود اس کے بیوی اور بچے اسے خدا کے حقوق کی ادائیگی سے روکنے والے بن جاتے ہیں، خواہ وہ یہ کام خیر خواہانہ ذہن سے کر رہے ہوں یا آدمی خود ان کی محبت میں خدا سے غافل ہو رہا ہو، بہر حال، دونوں صورتوں میں چونکہ اس کا نتیجہ اس کے لیے ہلاکت خیز ہوتا ہے، اس لیے ان کو دشمن کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان کی محبت میں گرفتار ہو کر خدا کے حقوق ہی سے غافل ہو جانے سے ضرور بچ کر رہے۔

لونگ پہننے کی شرعی حیثیت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سوال: شادی شدہ عورتوں کے ناک میں سوراخ کروا کر لونگ پہننے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ ہندوؤں میں پائی جانے والی رسوم میں سے ہے؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر صبح فرشتے انسانوں کی دنیا میں آ کر یہ دیکھتے ہیں کہ کون سی لڑکی شادی شدہ ہے اور کون سی نہیں، اور وہ شادی شدہ لڑکی کو ناک کے اس لونگ ہی سے پہچانتے ہیں۔ اس بات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (راشد محمود)

جواب: عورتوں کا اپنی زیب و زینت کے لیے مختلف طریقے اختیار کرنا خالصتاً معاشرتی مسئلہ ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مختلف تہذیبیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہمیں دوسری تہذیب سے غیر شرعی رسوم لینے سے منع کرتا ہے اور جو رسوم غیر شرعی نہیں ہیں، ان کو اپنا لینے پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

ناک میں سوراخ کروا کر لونگ پہننا مسلمانوں نے خواہ ہندوؤں ہی سے لیا ہو، لیکن اب یہ خود بعض علاقوں کے مسلمانوں میں رائج ہو گیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کوئی اسے اختیار کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے۔ البتہ، فرشتوں کے شادی شدہ لڑکیوں کو پہچاننے کے حوالے سے جو بات آپ نے لکھی ہے، وہ محض افسانہ ہے، اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

طالب محسن

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال وجواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی قرآن کے متعلق آرا

سوال: ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب ''ادب جاہلی'' میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں نہ صرف املا، بلکہ گرامر کی غلطیاں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی ہرزہ سرائی کی ہے۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ (محمد عارف جان)

جواب: قرآن مجید میں املا وہی قائم رکھی گئی ہے جو صحابہ رضوان اللہ علیہم نے کی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید اپنی اسی حالت پر قائم رہے جس میں صحابہ رضوان اللہ علیہم نے اسے امت کو منتقل کیا تھا۔ بعد میں املا کے طریقے تبدیل ہو گئے۔ یہ تبدیلی کئی پہلوؤں سے ہوئی ہے۔ اس کی روشنی میں قرآن کی املا کو تبدیل کرنا ناموزوں ہے۔ اگر قرآن میں موجود املا کو کوئی شخص غلط کہتا ہے تو وہ موجودہ املا کے قواعد کی روشنی میں کہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ قرآن کے بارے میں یہ بات اس طرح کہنے کے بجائے یہ کہنا چاہیے کہ قرآن میں بعض جگہ پر املا جدید املا سے مختلف ہے۔ باقی رہا یہ دعویٰ کہ قرآن میں گرامر کی غلطیاں ہیں تو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ قرآن گرامر کا تابع نہیں ہے۔ گرامر قرآن کے تابع ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ گرامر اہل زبان کے تعامل کو دیکھ کر مرتب کی جاتی ہے۔ اس میں

بعض قواعد ایسے بن جاتے ہیں جو اہل زبان کی بعض اختراعات کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ اس طرح کی صورت حال میں صحیح رویہ یہ نہیں کہ اہل زبان کی تحریر کو غلط قرار دیا جائے۔ صحیح رویہ یہ ہے کہ گرامر کے اس قاعدے میں ضروری ترمیم کر دی جائے۔ خدا کا کلام ہر طرح کے نقص سے پاک ہے۔ ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ طٰہٰ حسین اور بعض مستشرقین کی اس طرح کی مثالیں ان کی کم علمی کا مظہر ہیں۔ ہمارے رفیق معز امجد صاحب نے اس طرح کی بعض مثالوں کا تجزیہ کر کے یہ حقیقت پوری طرح ثابت کر دی ہے۔

آزمایش اور بلند مراتب

سوال: مفتی شفیع صاحب سورۂ انبیاء کی تفسیر میں حضرت ایوب علیہ السلام کے قصے کے ذیل میں ایک روایت نقل کرتے ہیں: 'اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الصالحون ثم الامثل فالامثل'۔ سوال یہ ہے کہ جس مومن پر سخت آزمایش نہیں آتی، اس کا مقام اللہ کے نزدیک بہت چھوٹا ہے؟ وضاحت فرمادیں۔ (وحدت یار)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جواب: اگر بڑی آزمایش یا سخت آزمایش کا مصداق صرف جسمانی تعذیب کو قرار دیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر یہ بات زیر بحث آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ دعوی ایمان کو آزمایشوں سے گزارتے ہیں، تاکہ دل کا کھوٹ یا ایمان کی کمزوری واضح ہو جائے اور کسی عذر کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔ یہ آزمایشیں جسمانی بھی ہوتی ہیں اور نفسیاتی بھی، معاشی بھی ہوتی ہیں اور معاشرتی بھی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو طائف کے سفر میں بھی ایک ابتلا پیش آئی تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جب تہمت لگی تو وہ بھی ایک ابتلا تھی۔ اگر آزمایش کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو دونوں ایک ہی درجے کی ہیں۔ اسی طرح وہ آدمی جس کو غربت کی آزمایش نے ایمان کی بازی ہرا دی اور وہ جہنم میں چلا گیا اور وہ آدمی جس کی دولت نے ایمان کی بازی ہرا دی اور وہ دوزخ میں چلا گیا، آخرت کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو دونوں بڑی آزمایش سے گزرے۔ ہاں دنیا میں ہمیں دھوکا ہوتا ہے کہ دولت والے پر کوئی آزمایش نہیں آئی۔

حدیث میں جو بات بیان ہوئی ہے، وہ قرآن مجید کے بیان کردہ اصول آزمایش کا بیان ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ایمان کو پرکھتے ہیں تو اسی سطح پر پرکھتے ہیں جس سطح کا دعوی ہے۔ ظاہر ہے کہ انبیا جس سطح پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ

ہوتے ہیں، اسی سطح کے مطابق ان پر امتحان بھی آتے ہیں اور وہ ان امتحانات سے سرخ رو نکلتے ہیں۔ یہی معاملہ دوسرے نیک لوگوں کا بھی ہے۔ جو ان امتحانات میں کامیاب ہو جاتے ہیں، انھیں یقیناً اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوگا۔ لیکن یہ بات قیامت کے دن ظاہر ہوگی۔ دنیا میں بڑی تکلیف کا آنا لازماً بلند مرتبہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

آزمایش کی حکمت

سوال: قرآن کریم اور احادیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان پر آزمایش آنا دو علتوں پر مبنی ہے۔ ایک جب انسان مومن جادۂ حق سے انحراف کر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تنبیہ کی خاطر آزمایش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ دوسری جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ کسی بندۂ مومن کا درجہ اونچا کرے تو اس کو آزمایش میں ڈالتا ہے جیسے انبیا علیہم السلام کا حال ہے۔ براہ کرم اس موضوع پر قرآن کریم اور صحیح احادیث کی روشنی میں جواب دیں۔ (وحدت یار)

جواب: آزمایش کے دو پہلو ہیں۔ ایک آزمایش یہ کہ ہم جس ایمان کے مدعی ہیں، اس کی حقیقت اچھی طرح متعین ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ دین پر عمل کرتے ہوئے تزکیۂ نفس کا جو سفر ہم نے شروع کیا ہے، وہ بھی تکمیل کو پہنچے۔ ہمارے اخلاق اور دین و ایمان پر استقامت ہر لمحے معرض امتحان میں رہتے ہیں۔ جب جب آزمایش آتی ہے اور یہ صبر اور شکر، دونوں پہلوؤں سے ہوتی ہے اور ہم اس میں کامیاب ہوتے رہتے ہیں تو یہ ہمارے ایمان میں ترقی کا زینہ بنتی چلی جاتی ہے۔ اس پہلو سے آپ کی بات درست ہے کہ یہ مومن کے لیے بلند درجے کے حصول کا ذریعہ ہے۔ آپ کی یہ بات بھی درست ہے کہ بعض تکلیفیں غفلت سے بیداری کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت کا اظہار بھی ہیں کہ انھوں نے گرتے ہوئے شخص کو سنبھلنے کا ایک موقع فراہم کر دیا ہے۔ لیکن آزمایش کے کچھ اور پہلو بھی ہیں جن میں ایک دو امور کی طرف اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر کے واقعات میں بھی ہوا ہے۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ یہ دنیا آزمایش کے لیے ہے۔ اس میں امتحان اور اس کے لوازم کی حیثیت سے ترغیب و ترہیب کے مراحل بھی پیش آتے ہیں۔ لیکن ہر واقعے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہمارے ادراک کے لیے ممکن نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سفر سے ایک یہ بات بھی واضح ہوتی ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بھولا اور سیانا مومن

سوال: احادیث میں ہے: 'المؤمن غر کریم ...' (مومن مہربان بھولا ہے...)، 'لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین ...' (مومن ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا...)، 'اتقوا فراسة المؤمن فإنه یری بنور ربه...' (مومن کی فراست سے بچو وہ اپنے رب کے نور سے دیکھتا ہے...)۔ بظاہر ان روایات میں تناقض ہے۔ ان روایتوں کو کس طرح جمع کریں گے؟ (وحدت یار)

جواب: دونوں باتوں کا محل الگ الگ ہے۔ شارحین نے بالکل صحیح بیان کیا ہے کہ اس سے فریب اور چالاکی کی نفی کی گئی ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ مومن سمجھ دار نہیں ہوتا۔ مومن خدا کے حضور جواب دہی کے احساس کے تحت فریب اور سازش جیسے مکروہ کاموں سے گریزاں رہتا ہے۔ دوسرے وہ حسن ظن اور خیر خواہی کے جذبے کے تحت خود غرضی اور موقع پرستی جیسے عوارض سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے رویے اور عمل میں ایک سادہ آدمی نظر آتا ہے۔ غالباً یہی بات ہے جس کے لیے 'غر کریم' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ دوسری روایتوں میں مومن کے سمجھ دار ہونے کے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی سمجھ کا اعلیٰ ترین اظہار اخلاق کی درستی اور جذبات کے صحیح رخ پر استوار ہونے میں ہے۔ دین کی تعلیمات دل و دماغ میں اتر جائیں اور عمل اس کے مطابق ڈھل جائے تو وہ فراست حاصل ہو جاتی ہے جسے فراست مومن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ باقی رہے دنیا کے شر تو اللہ تعالیٰ ان سے حفاظت کا بندوبست ایسے صالحین کے لیے اپنی جناب سے کرتے رہتے ہیں۔

امریکہ سے جہاد

سوال: موجودہ ظروف و شرائط میں جہاد افغانستان برضد امریکا کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیا اس کو جہاد کہہ سکتے ہیں۔ کیا کسی خاص شرائط میں انفرادی جہاد جائز ہے۔ مثلاً کسی اسلامی ملک پر کافر یلغار کریں اور حکومت وقت بزدل ہو کر کفار سے ہم نوا ہو جائے۔ اس صورت حال میں دین کا تقاضا کیا ہے؟

(وحدت یار)

جواب: ہماری رائے میں حالات خواہ کچھ بھی ہوں، انفرادی جہاد جائز نہیں ہے۔ حکومت کا بزدل ہونا یا جہاد کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ذمہ داری ادا نہ کرنا کسی مسلمان کو اس کا مکلّف نہیں ٹھیراتا کہ وہ خود جہاد کرنے لگے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ حکومت کو اس کی ذمہ داری ادا کرنے پر آمادہ کرے اور جب تک حکومت آمادہ نہ ہو کوئی قدم آگے نہ بڑھائے۔ سیاسی گروہوں کی سیاسی جدوجہد دنیوی سیاست ہے۔ اسے خواہ مخواہ دینی عنوانات دینے سے صورت حال پیچیدہ ہوتی ہے۔ اسلامی جہاد صرف وہ ہے جو باقاعدہ حکومت کے تحت کسی ظلم کے استیصال کے لیے ہو یا مسلم وطن کے دفاع کے لیے کیا جائے۔ باقی رہی سیاسی جدوجہد تو اس کے لیے کسی کی جان لینا دین کی رو سے جائز نہیں۔ مزید براں امت مسلمہ کی حالت زار کے پیش نظر تدبیر کی سطح پر بھی یہ نقصان کا باعث ہے اور منزل دور سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

محتاجی سے بچنے کی دعا

سوال: میرے ہاتھ میں آپ کا رسالہ ماہنامہ ''اشراق'' ماہ جون ۲۰۰۶ ہے۔ اس کے ٹائٹل پر درج ہے: ''اللہ تعالیٰ نے یہ نظام اس طرح قائم کیا ہے کہ یہاں سب لوگ ایک دوسرے کے محتاج اور محتاج الیہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔'' میں ہی نہیں، سب لوگ یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ کسی کا محتاج نہ کرے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم غلط دعا کرتے ہیں؟ (برکت علی)

جواب: آپ کی دعا بالکل درست ہے۔ ہماری بھی دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کسی کا محتاج نہ کرے۔ آمین۔ محولہ عبارت میں جو محتاجی بیان ہوئی ہے، اس میں اور ہماری دعا کی محتاجی میں فرق ہے۔ ہم تو صحت اور اپنی کمائی کے جاری رہنے کی دعا کرتے ہیں۔ صحت اس لیے کہ ہم موت تک اپنے سارے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے ہوئے رخصت ہوں۔ کسی کی ذمہ داری نہ بن جائیں۔ اپنی کمائی اس لیے کہ ہمیں کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ محولہ عبارت میں محتاجی سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی معیشت کا پہیہ چلانے کے لیے دونوں طرح کے لوگوں کی ضرورت ہے۔ ایک وہ جو سرمایہ فراہم کریں اور انتظام کریں اور دوسرے وہ جو ان کے لیے کام کریں۔ اس طرح لوگ مختلف خدمات انجام دیتے ہیں اور معیشت کی گاڑی رواں دواں رہتی ہے۔ غرض یہ کہ اس عبارت میں اس نوعیت کی خدمات کے لیے محتاج اور محتاج الیہ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قومی بچت سرٹیفکیٹ

سوال: عمر کے ساتھ ساتھ میرے سب جوڑ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ میں صرف ۲۴۰۰ روپے پنشن حاصل کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف ۸۱ سال ہے۔ بے کاری کی مدت بھی تقریباً چھ سال ہو گئی ہے۔ اب پنشن ۳۰۰۰ روپے ملتی ہے۔ جو اس زمانے میں گزارے کے لیے ناکافی ہے۔ مزید یہ کہ کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ میں نے اپنی رقم سے جو رکھے رکھے کم سے کم ہوتی جا رہی تھی، قومی بچت کے دفتر سے سرٹیفکیٹس بہبود اسکیم لے لیے ہیں۔ ان سے بھی تقریباً ۳۰۰۰ روپے مل جاتے ہیں۔ اس طرح چھ ہزار روپے سے کچھ گزارہ ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کے ساتھ کاروبار میں لگا دوں تو آپ کے علم میں ہوگا کہ قرآن چھاپنے والے ادارے بھی لوگوں کے پیسے ہضم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ سرٹیفکیٹ کی آمدنی حرام ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟

جواب: سرٹیفکیٹ سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے، وہ سود کی آمدنی ہے۔ حکومت نے عوام سے قرضہ لینے کے لیے یہ اسکیم بنائی ہوئی ہے۔ حکومت اس قرض پر عوام کو سود ادا کرتی ہے۔ آپ نے جیسے اپنے حالات لکھے ہیں، ان میں آپ کو کوئی دوسرا مشورہ دینا مشکل ہے۔ بہر حال، اگر آپ اپنے آپ کو اس معاملے میں معذور سمجھتے ہیں اور آپ کے لیے کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے تو آپ اس آمدنی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ آپ کے عذر کے پیش نظر آپ کے اس معاملے سے درگزر فرمائیں گے۔ لیکن یہ فیصلہ آپ ہی نے کرنا ہے کہ آپ معذور ہیں اور آپ کو یہ روپے لے لینے چاہییں۔

آپ کا سوال یہی تھا، جو میں نے اوپر نقل کر دیا ہے۔ باقی آپ نے ان لوگوں کی مثالیں دی ہیں جو لوگوں کے ساتھ دھوکا اور فریب کر کے انھیں لوٹ رہے ہیں۔ آپ یہ مثالیں دے کر اپنا یہ خیال موکد کرتے ہیں کہ سرٹیفکیٹ کی آمدنی لینا، اس طرح لوگوں کو لوٹنے سے بہتر ہے۔ دیکھیے، جس طرح ان لوگوں کی آمدنی حرام ہے، اسی طرح سود کی آمدنی بھی حرام ہے۔ صورت واقعہ کے پہلو سے اگر کچھ فرق ہے تو وہ اس کو جائز نہیں بنا سکتا۔ ہاں، ایک معذور آدمی کے نقطۂ نظر سے آپ کا اسے ترجیح دینا سمجھ میں آتا ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر پر اشکال

سوال: قرآن مجید میں آتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال دعوت وتبلیغ کا کام کیا۔ اب تک میرا خیال تھا کہ انسان کی اوسط زندگی اور قد کاٹھ ایک جیسا ہی ہے۔ دو چار انچ یا پانچ دس سال کا فرق تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن روایات میں عوج بن عنق کے قد کاٹھ کے بارے میں جس طرح مبالغہ آرائی پائی جاتی ہے، وہ حقیقت نظر نہیں آتی۔ چونکہ ان کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، اس لیے ہم آسانی سے اس کی تردید کر سکتے ہیں۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی ۹۵۰ سال تبلیغ کا ذکر قرآن مجید میں ہے جس کو ہم کسی صورت نہیں جھٹلا سکتے۔ کیا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے تمام افراد کی عمریں اتنی ہی تھیں؟ اس قوم کے قد کاٹھ ہمارے جیسے تھے یا ان کی نوعیت کچھ اور تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ اب سے چار پانچ ہزار سال پہلے بتاتے ہیں۔ چار پانچ ہزار سال انسانی تاریخ میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ یہ بات کسی طور سمجھ میں نہیں آتی کہ صرف چار ہزار سال پہلے کسی کی عمر ہزار سال ہو۔ قرآن سے کسی اور پیغمبر کے بارے میں اس طرح کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ (محمد عارف جان)

جواب: حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ قبل تاریخ کا زمانہ ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ بائیبل میں دیے گئے شجرۂ نسب سے حضرت آدم اور حضرت نوح وغیرہ کے زمانے کا اندازہ لگانا درست نہیں ہے۔ اس شجرۂ نسب میں وہی نام باقی رہ گئے ہیں جو بہت معروف ہو گئے تھے اور بیچ کی کئی نسلیں غائب ہیں۔ ان کے خیال میں یہ درحقیقت بڑے بڑے سرداروں کے نام ہیں۔ ایک اور دوسرے شخص کے بیچ میں ممکن ہے، کئی سو برس کا فاصلہ ہو۔ ان کی اس رائے کو سامنے رکھیں جو واضح طور پر درست لگتی ہے تو حضرت نوح کے زمانے کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کرنا ممکن نہیں۔ البتہ اگر کوئی خارجی شواہد موجود ہوتے تو ہمیں کوئی رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔ لیکن حضرت نوح کے حوالے سے ایسے کوئی شواہد میرے علم کی حد تک ابھی تک نہیں ملے۔

اب ہمارے پاس واحد یقینی ذریعہ قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید میں بھی صرف حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ہی کا ذکر ہے۔ کوئی اور بات اس زمانے کے انسانوں کے حوالے سے مذکور نہیں ہے۔ بائیبل کتاب پیدایش کے باب ۵ اور ۶ میں جو تفصیل منقول ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لمبی عمروں کا یہ سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ختم کر دیا گیا۔ قرآن مجید کے بیان کی روشنی میں ہم یہ اندازہ ہی لگا سکتے ہیں کہ بائیبل کا یہ بیان درست ہو۔ لیکن یقینی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

رائے کے لیے سائنسی شواہد کی دستیابی ضروری ہے، البتہ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کا بیان حتمی ہے اوران کے بارے میں ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی عمر یہی تھی۔

یہ سوال کہ اس زمانے کے لوگوں کے قد کاٹھ کیا تھے، اس کا واحد ماخذ اسرائیلی روایات ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اس سلسلے میں جو کچھ مروی ہے، وہ انھی روایات سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اس باب میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ جو خارجی شواہد ابھی تک سامنے آئے ہیں، ان سے تو قد کاٹھ کے بارے میں ان بیانات کی تائید نہیں ہوتی۔ لیکن قبل تاریخ کے انسان کے بارے میں ان تصورات کی قطعی تردید بھی شاید ابھی ممکن نہیں ہے۔

معلوم تاریخ کے انسان کی عمر اور قد کاٹھ کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ آج کے انسان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ خارجی شواہد یعنی عمارتیں اور دوسرے آثار سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن کیا اس کی روشنی میں ہم قرآن کے بیان کی نفی کر سکتے ہیں۔ یقیناً اس نفی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ قرآن کے بیان کو ماننے کے بعد ہم یہ اندازہ بھی قائم کر سکتے ہیں کہ ان کے زمانے میں عام عمریں بھی ایسی ہی تھیں۔ اس اندازے کی تائید بائیبل کے بیان سے بھی ہوتی ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کو ایک معجزہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ باقی رہا قد کاٹھ تو اس باب میں کوئی یقینی بات ہمارے پاس نہیں ہے۔ خارجی شواہد کی روشنی میں ہم ان اسرائیلی روایات کو رد بھی کر سکتے ہیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net